کیا اسلام فرد کا نجی مسئلہ ہے؟

سیکولرزم اور ملٹی کلچرل ازم کا تنقیدی جائزہ

محمد زاہد صدیق مغل مولوی سید محبوب الحسن

[چند ضروری وضاحتیں: گو کہ یہ مضمون ساحل کے نومبر ۲۰۰۶ میں چھپنے والے ہمارے مضمون سے پیوست ہے لیکن اس کے زیادہ تر مباحث کی تفہیم اس کے بغیر بھی ممکن ہے۔ مضمون کے مباحث میں کئی مقامات پر دوران بحث مذہب کا لفظ عام طور پر استعمال کر دیا گیا ہے، لیکن اس سے ہماری مراد اسلام ہی ہے کیونکہ سارے مضمون میں ہم نے اسلام ہی کے تناظر میں بحث کی ہے]

الحمد لله و كفى ، و الصلاة و السلام على من لا نبى بعده الا كذاب

ساحل کے نومبر ۲۰۰۶ کے شمارے میں ہم نے جمہوریت کی اصل حقیقت واضح کرنے کی کوشش کی تھی۔ چند جملوں میں پورے مضمون کا خلاصہ یوں بیان کیا جا سکتا ہے کہ:

☆ جمہوریت ایک ایسا نظام حکومت ہے جس میں فیصلے نہ اس بنیاد پر ہوتے ہیں کہ خدا کی مرضی کیا ہے اور نہ ہی اس بنیاد پر کہ عوام کیا چاہتے ہیں، بلکہ اس میں فیصلے مفروضے بلکہ ایمانیات یا اس Dogma کی بنیاد پر ہوتے ہیں کہ 'عوام آزادی چاہتے ہیں' [یعنی اس میں آزادی مفروضے کے طور پر لی جاتی ہے]۔

☆ جمہوری معاشرہ ایک سول سوسائٹی ہوتی ہے جسکی چند اہم خصوصیات اس طرح بیان کی جا سکتی ہیں کہ یہ ایک ایسا معاشرہ ہے جہاں:

[۱] تعلقات کی بنیاد غرض اور لین دین کے اصول پر ہوتی ہے۔ [۲] تعلقات کا مقصد سرمائے میں اضافہ ہوتا ہے۔ [۳] کامیابی کا معیار دولت اور آمدنی سے منسلک ہو جاتا ہے جبکہ زندگی کے معنی رسوم عبودیت ادا کرنے کے بجائے عمل صرف کی زیادتی میں تلاش کئے جاتے ہیں۔ [۴] مذہبی عقلیت و اقدار بے معنی ہو جاتی ہیں، انکی جگہ حرص و حسد اور آخرت سے غفلت پروان چڑھتی ہیں۔

☆ آزادی پر مبنی سرمایہ دارانہ نظام زندگی کی تشکیل اور بالادستی کیلئے عملی تدابیر [پالیسیاں] تحریک تنویر

[Enlightenment ú] سے جنم لینے والی سوشل سائنسز فراہم کرتی ہیں۔لہذا عملی حکمرانی انہیں سوشل سائنسز کی علمیت اور انکے ماہرین کی ہوتی ہے

☆ سوشل سائنسز آزادی یعنی سرمائے کی بڑھوتری کا علمی جواز فراہم کرتی ہیں تا کہ عوام الناس اس شیطانی مقصد زندگی کی معاشرتی بالادستی کو بطور ایک نا قابل انکار حقیقت کے قبول اور برداشت کرنا سیکھ لیں

مقصد مضمون

اس مضمون میں ہمارا مقصد ان نظریات کا جائزہ لینا ہے جو اسلام کو جمہوریت کی روشنی اور پس منظر میں سمجھنے کیلئے وضع کئے گئے ہیں۔اس سلسلے میں عمومی طور پر دو قسم کے رویے پائے جاتے ہیں، ایک سیکولر دوسرا معذرت خواہانہ۔ساحل کے دسمبر ۲۰۰۶ کے شمارے میں علامہ مولانا سلیمان ندویؒ اور عبدالماجد دریا آبادیؒ کے مضامین میں معذرت خواہانہ طبقے کے نظریات کا تنقیدی جائزہ بخوبی آ گیا تھا۔اس مضمون میں ہم انشاءاللہ سیکولر طبقے کے نظریات مختصراً زیر بحث لائیں گے۔

مذہبی جدیدیت پسندی کی تین مختلف شکلیں

البتہ اس سے قبل مناسب معلوم ہوتا ہے کہ ہم مذہبی جدیدیت پسندی کے خدوخال بھی مختصراً واضح کر دیں۔مذہبی معاملات میں جدیدیت پسندی کا اظہار تین قسم کے رویوں میں ہوتا ہے:

[الف] مغرب سے مرعوبیت کی بناء پر اسلامی تاریخ کی معتبر تعبیر چھوڑ کر ایک نئی تعبیر تلاش و پیش کرنا۔اس فکر کے حاملین اسلامی تاریخ اور علمیت کو مکمل طور پر رد نہیں کرتے،لیکن جدید دور میں پائے جانے والے تمام مغربی تصورات کو خیر تسلیم کر کے اسلامی تاریخ ہی کا تسلسل گردانتے ہیں۔کبھی وہ کہتے ہیں کہ سائنس کے اصل موجد تو مسلمان تھے نیز یہ کہ سائنس اصل میں مسلمانوں کی کھوئی ہوئی میراث ہے، کبھی ملٹی کلچرل ازم (multi-culturalism) یعنی کثیر معاشرتی نظام کو مدنی معاشرے میں تلاش کیا جاتا ہے،امام ابوحنیفہؒ کی ذات میں موجودہ بینکاری نظام کا بانی دکھایا جاتا ہے،معتزلہ کو بھی اسلامی تاریخ کا اہم گروہ بنا کر دکھایا جاتا ہے نیز انکی شکست کو امت مسلمہ کے جمود کا شاخسانہ قرار دیا جاتا ہے، جمہوریت کو بھی اسلام ہی کا عطیہ قرار دیا جاتا ہے وغیرہ وغیرہ۔المختصر دور جدید میں مقبول عام ہر جاہلانہ تصور کو کسی نہ کسی طرح اسلامی تاریخ سے جوڑ دینے میں ہی اسلام کی بقا سمجھی جاتی ہے۔اس رویے کی سب سے بہترین عکاسی علامہ اقبالؒ کے خطبات میں ملتی ہے۔اس طبقے کو ہم revisionist طبقہ کہہ سکتے ہیں۔

[ب] جدیدیت زیادہ بگڑی ہوئی شکل میں اپنا اظہار اس دعوے کے ساتھ کرتی ہے کہ آج تک کوئی بھی شخص اسلام کو صحیح طور پر نہیں سمجھ سکا،اور میں وہ پہلا انسان ہوں جس پر اسلام کی اصل حقیقت کھل کر سامنے آئی ہے،لہذا سب لوگوں کیلئے لازم ہے کہ چودہ سو سال کے اجماع امت کو زمیں بوس کر کے میری پیروی کریں۔

اس رویے کی ایک شکل یہ دعوی بھی ہوتا ہے کہ اسلاف نے اپنے وقت کے تقاضوں کے مطابق اسلام کی ایک ایسی تشریح کی تھی جو انکی معاشرتی ضروریات پوری کرتی تھی، اور چونکہ اب حالات بدل گئے ہیں لہذا ہمیں اپنے دور کے مطابق اسلام کی ایک نئی تعبیر وتشریح وضع کرنی چاہئے کیونکہ پرانی تعبیر اب قابل عمل نہیں رہی۔ برصغیر میں اس فکر کے بانی سرسید احمد خان تھے۔ اس فکر نے اپنا اظہار مختلف النوع قسم کی گمراہیوں کی شکل میں کیا۔ یہ طبقہ جمہوریت کی سمجھ بوجھ کے بغیر ہی اسے اسلام کا اصلی اور واحد نظام حکومت ثابت کرنے کی ٹھان بیٹھا ہے۔ یہ گروہ جمہوریت سے مرعوبیت کی بنا پر کبھی ملوکیت کو تمام برائیوں کا منبع فرض کر کے پوری اسلامی تاریخ پر خط تنسیخ پھیر دیتا ہے، اور کبھی خلافت کو جمہوریت کا ہم معنی قرار دے کر حضرات صحابہ کرام رضوان اللہ تعالی علیہم اجمعین پر طعن وتشنیع کے تیر برساتا ہے۔ جب دلائل تلاش کرنے کی بات آئی تو اس کیلئے قرآنی آیات اور احادیث کی دور از کار تاویلات سے لیکر ہر گری پڑی تاریخی شہادت اور واقعے سے بھی گریز نہ کیا گیا، کیونکہ جب معاملہ بے اصولی تاویلات کا ہی ٹھہرا، تو پھر جمہوریت ہی کیا کوئی بھی نظریہ قرآن سے ثابت کیا جاسکتا ہے۔ ان مفکرین نے تو ڈارون اور کائنات کی ابتدا کے سائنسی نظریات سے لیکر مارکسزم، کیپیٹلزم، لبرلزم اور سیکولرزم جیسے مذہب دشمن معاشرتی نظریات نیز ہیومن رائٹس جیسے کافرانہ تصورات تک اسی قرآن سے ثابت کر دکھائے ہیں۔ آجکل اس فکر کے سب سے بڑے چمپئین جاوید احمد غامدی صاحب ہیں۔

[ج] جدیدیت کا بدترین ظہور سیکولرزم کی صورت میں ہوتا ہے جسکے مطابق مذہب فرد کا صرف ذاتی مسئلہ قرار پاتا ہے نیز معاشرتی تشکیل اور ادارتی وریاستی صف بندی سے اسے بے دخل کر دیا جاتا ہے۔ یہ طبقہ جمہوری اقدار اور ہیومن رائٹس کی بالادستی کا دعوی دار ہے۔ اس طبقے نے عام مسلمانوں کو دھوکہ دینے اور انکی توجہ حاصل کرنے کیلئے جمہوریت جیسے ابلیسی تصور حیات کے حق میں اسلامی علمیت سے جھوٹی دلیلیں تراش رکھیں ہیں حالانکہ اس طبقے کو مذہب سے اصلاً کوئی دلچسپی نہیں۔ آجکل مہدی حسن، ڈاکٹر منظور احمد، ڈاکٹر مبارک علی، ڈاکٹر جاوید اقبال اور انکے ہمنوا اکثر ٹی وی پروگراموں میں اس فکر کا پرچار کرتے دکھائی دیتے ہیں۔

مذہبی جدیدیت پسندوں کے اہم خصائص: یہ تینوں طبقات درحقیقت ایک دوسرے کے مؤید و مددگار کی حیثیت سے کام کرتے ہیں اور ان سب کا اصل مسئلہ عقل کو وحی سے بالاتر یا کم از کم اسکے برابر ذریعہ علم سمجھنا ہے، اور امت مسلمہ کی پوری تاریخ میں اس گمراہی کے نشانات سوائے معتزلہ کے اور کسی گروہ کے ہاں نہیں ملتے۔ بغور دیکھا جائے تو جدیدیت پسندی کے تمام ٹولوں میں چند مشترک امور نظر آتے ہیں، مثلاً: [۱] نقلی دلائل کو اہمیت دینے کے بجائے رائے پرستی اور عقلی قیاسات کی بنیاد پر بڑے بڑے مفروضے قائم کر لینا۔ [۲] عوام الناس میں یہ گمراہی پھیلانا کہ قرآن کی تشریح ہر شخص کر سکتا ہے، اس کیلئے کسی خاص قسم کی علمی لیاقت اور مہارت کی ضرورت نہیں۔ [۳] کسی نا کسی درجے میں حدیث کی حجیت کا انکار کرنا یا اسکی تشریعی حیثیت کم کرنا۔ سارا زور اکیلے قرآن کی طرف توجہ

دلانے پر صرف کرنا

[۴] مختلف درجوں میں اسلاف پر طعن وتشنیع کے تیر برسانا اور اجماع امت یہاں تک کہ تعامل صحابہؓ کو پس پشت ڈال کر اسلام فہمی کا شوق رکھنا۔ [۵] چونکہ عوام الناس قطعی طور پر ان کے بیہودہ نظریات سے ابا کرتی ہے، لہذا اپنے نظریات کے پرچار اور تسلط کیلئے ریاست کی سرپرستی میں کام کرنا [معتزلہ کی پوری تاریخ اسکا منہ بولتا ثبوت ہے، اسی طرح جدید ترکی کی تاریخ اور آج کل پاکستان کے جدیدیت پسند طبقے کے حالات بھی سب لوگوں کے سامنے ہیں] [۶] اسلام کے خودساختہ فلسفے پر محض خوش نما تقاریر کرنے کا شوق رکھنا، لیکن احکامات شریعت کی دائمی پابندی، تقوی، عشق رسول ﷺ اور عزیمت جیسی صفات عالیہ سے کوسوں دور ہونا۔

جدیدیت پسندوں کے اعتراضات کے اصل مقاصد:

درحقیقت جدیدیت پسندوں کے نظریات مان لینے کا لازمی تقاضا یہ ہے کہ ہم یہ مان لیں کہ پوری امت مسلمہ چودہ سو سال تک اللہ اور اسکے رسول ﷺ کی شریعت کے ایک ایسے حکم کی خلاف ورزی کرتے رہے جس پر عمل کرنا اسکا اجتماعی فریضہ تھا۔ نتیجتاً امت مسلمہ کا فریضہ قرار پایا کہ نہ صرف یہ کہ وہ فوراً اپنی اس غلطی کا اعتراف کرکے اس خاص نوع کے نظام حکومت کی حقانیت پر قرآن وسنت سے دلائل جمع کردے، بلکہ ساتھ ہی ساتھ امت مسلمہ کے تمام آئمہ مفسرین، محدثین، مجتہدین اور اولیاء کرام کی مغفرت کی دعا بھی کرے کہ جنکے غلط طرز عمل اور سستی کی وجہ سے امت مسلمہ ایک عظیم الشان دینی فریضے کی ادائیگی سے غافل رہ گئی۔ یہ تمام رویے مرعوبیت اور انگریز کی اس فکری ذہنی غلامی کا شاخسانہ ہیں جو برصغیر کے مسلمانوں کو ورثے میں ملی ہے۔ اللہ تعالی ہمارے فقہاء کو کروٹ کروٹ جنت نصیب کرے جنہوں نے کسی بیرونی نظامہائے علم سے متاثر ہوئے بغیر ہی فقہ اسلامی کی وہ بلند وبالا اور عظیم الشان عمارت تعمیر کردی کہ جسے دیکھ کر آج بھی گردنیں فخر سے بلند ہوجاتی ہیں۔ جب یہ گمراہ لوگ دیکھتے ہیں کہ امت مسلمہ انکے باطل نظریات کو تسلیم کرنے سے گریزاں ہے تو یہ بجائے اپنی اصلاح کرنے کے آئمہ اور اکابرین امت پر الزام تراشی کرنے لگتے ہیں۔ کبھی کہا جاتا ہے کہ فقہ کا عظیم الشان ذخیرہ یونانیوں اور رومیوں سے مستعار ہے، کبھی یہ الزام لگایا جاتا ہے کہ ساری فقہ دور ملوکیت کی پیداوار اور غلام ہے اور اگر اس سے بھی دل کا غبار نہ نکلے تو کہہ دیا جاتا ہے کہ اسلام کی اصل تعلیمات عجمی سازش کی آمیزش کا شکار ہوکر رہ گئیں [نعوذ بالله من تلك الهفوات]۔ ان تمام دعووں کیلئے نہ تو کسی عقلی دلیل اور نہ ہی کسی نقلی شہادت کی ضرورت پڑی، بس ادھر ادھر کے چند واقعات کو توڑ موڑ کر نتیجے نکال لئے گئے ہیں۔ حق بات یہ ہے کہ یہ تینوں گروہ اس صراط مستقیم سے ہٹے ہوئے ہیں جس پر ہمارے اسلاف کا اجماع تھا اور علمائے حق نے آج بھی جسے مضبوطی سے تھام رکھا ہے۔

مضمون کے پہلے حصے میں ہم سیکولر طبقے کے دعووں کا تجزیہ اور دوسرے میں انکے چند دلائل کا تنقیدی

جائزہ پیش کریں گے۔حق بات یہ ہے کہ یہ گروہ جتنے بھی دعوے اور تاویلات پیش کرتا ہے وہ دلیل سے زیادہ مغربی اور اسلامی فکر سے کلیتاً لاعلمی کی عکاسی کرتے ہیں۔سیکولر جدیدیت پسند نہ علوم اسلام پر عبور رکھتے ہیں نہ ہی مغربی علوم فلسفہ فلسفہ سائنس وٹیکنالوجی پر ان کی گرفت ہے۔یہ روحانی طور پر مغرب سے مغلوب ہیں اور ہر صورت میں مغرب کا دفاع کرنا چاہتے ہیں۔ہم تمام دلائل علیحدہ علیحدہ ذکر کر کے انکا محاکمہ کرنے کی کوشش کریں گے،

وماتوفیقی الا باللہ العظیم

ا۔سیکولر طبقے کے دعووں کی نوعیت اور انکا تجزیہ

جیسا کہ اوپر ذکر کیا گیا کہ یہ طبقہ مذہب کو فرد کا نجی مسئلہ قرار دیتا ہے یعنی مذہب کا تعلق ایک فرد کی صرف ذاتی یا نجی زندگی (private life) سے ہے اس دعوے کا تجزیہ کرنے سے پہلے ہم اس کے مطلب کی وضاحت کرتے ہیں۔

مذہب بحیثیت نجی مسئلہ کے اصولی معنی

اس دعوے کا مطلب یہ ہے کہ:

[۱] مذہب کا افراد کے معاشرتی تعلقات کی تشکیل اور ترتیب متعین کرنے میں کوئی حصہ نہیں ہونا چاہئے

[۲] معاشرتی صف بندی میں افراد کا مقام اور درجہ بندی طے کرنے میں مذہبی اقدار کا عمل دخل نہیں ہونا چاہئے۔

قبل اسکے کہ ہم اس دعوے کا بودہ پن ظاہر کریں، یہ بات نوٹ کرلیں کہ اس بات میں کوئی شک نہیں کہ اگر جمہوری عمل ہی کو ریاستی صف بندی کا اصل الاصول مان لیا جائے تو مذہب کی زیادہ سے زیادہ حیثیت نجی معاملے کے اور کچھ نہیں رہ جاتی۔اس اجمال کی تفصیل کیلئے جمہوریت پر ہمارا مضمون دیکھئے [ساحل، نومبر ۲۰۰۶]۔مختصر یوں سمجھئے کہ جمہوریت کا جواز فرد کی آزادی [یعنی عبدیت کے انکار] کے تصور پر مبنی ہے اور آزادی کا تصور فرد کی زندگی کو دو حصوں میں تقسیم کر دیتا ہے: [۱] نجی زندگی (private life)، [۲] اجتماعی زندگی (public life)۔ پرائیویٹ لائف سے مراد کسی شخص کی زندگی کا وہ گوشہ ہے جسمیں کوئی فرد کسی دوسرے کی مداخلت کے بغیر جو کرنا چاہے کر سکے، دوسرے لفظوں میں اپنے لئے خیر وشر اور خواہشات کی ترجیحات کا جو پیمانہ طے کرنا چاہے کر سکے: جمناسٹک کلب جانا چاہے تو جا سکے، بندروں کی زندگی کے حالات جمع کرنے پر پوری زندگی صرف کرنا چاہے تو کر لے، شراب خانہ جانا چاہے تو چلا جائے اور اگر مسجد یا گرجا وغیرہ کی سیر کرنا چاہے تو کر لے۔الغرض اپنی ذاتی زندگی کو جیسے چاہے مرتب کر لے چونکہ زندگی گزارنے کے تمام طریقے برابر حیثیت رکھتے ہیں [یعنی لایعنی ہیں]۔اسکے مقابلے میں پبلک زندگی سے مراد فرد کی زندگی کا وہ حصہ ہے جو وہ دوسرے افراد

کے ساتھ تعلقات قائم کر کے گذارتا ہے، اور ان تعلقات کے نتیجے میں ایک معاشرہ اور ریاست وجود میں آتی ہے۔ جمہوری ریاست میں ان تعلقات کی بنیاد افراد کی اغراض اور خواہشات کی تکمیل ہوتی ہے نیز اجتماعی فیصلے اس بنیاد پر طے ہوتے ہیں کہ عوام زیادہ سے زیادہ آزادی یعنی سرمائے کا حصول چاہتے ہیں۔ اس کے برعکس مذہب خصوصاً اسلام اس بات کا مدعی ہے کہ فرد کی ذاتی زندگی ہو یا اجتماعی، فیصلے اس بنیاد پر ہونے چاہئیں کہ خدا کیا چاہتا ہے اور یہ بات جمہوریت کی روح کی عین نفی اور ضد ہے [کیونکہ عبدیت اور آزادی بالکل اسی طرح ایک جگہ جمع نہیں ہو سکتے جیسے ایمان اور کفر]۔ لہٰذا اگر مذہب ایک فرد کی نجی زندگی سے باہر نکل کر افراد کی معاشرتی زندگی میں قدم رکھتا ہے تو وہ لازماً جمہوریت کو نیست و نابود کر دے گا۔ پس ایک جمہوری ریاست کیلئے لازم ہے کہ وہ مذہب کو فرد کی ذاتی زندگی کے دائرے میں محصور کر کے رکھے اور اسکے دائرے عمل کو جس قدر کم ہو سکے کم کرنے کی کوشش کرے۔ اگر کوئی شخص چاہتا ہے تو اپنی مذہبیت کا اظہار اپنی زندگی میں جس قدر چاہے کرے، لیکن وہ اس بات کا حق نہیں رکھتا کہ اپنی مذہبیت کو اپنی بیوی، بچوں، خاندان یا اولاد پر نافذ کرنے کی کوشش کرے، چہ جائیکہ مذہب کو اسمبلی کے ایوان یا ریاست کے دیوان میں لے آئے۔

'مذہب [اسلام] نجی مسئلہ ہے' کے لازمی منطقی نتائج: اب اس دعوے کے چند مضمرات [implications] کا جائزہ لیتے ہیں۔ اس بحث میں ہم یہ دکھانے کی کوشش کریں گے کہ مذہب کو فرد کا ذاتی مسئلہ قرار دینے کے بعد درج ذیل لازمی نتائج قبول کرنا پڑتے ہیں۔

[ا] **معاشرتی تعلقات کی بنیاد ایمان اور معاشرتی معیار تقویٰ نہیں:** تمام مذہبی احکام بشمول فرائض و سنن اور مذہبی اقدار کی ادائیگی اور عدم ادائیگی کا ایک فرد کے معاشرتی مقام طے کرنے میں کوئی کردار نہیں ہے۔ مثلاً ایک شخص نماز ادا کرتا ہے یا نہیں اس کا اس بات سے کوئی تعلق نہیں کہ وہ اسلامی ریاست کا صدر یا وزیر وغیرہ بن سکتا ہے۔ اسی طرح ایک شخص شراب پینے یا زنا کرنے کے باوجود معاشرتی صف بندی میں ہر مقام حاصل کر سکنے کا جواز رکھتا ہے، مثلاً وہ سی ایس پی آفیسر بن سکتا ہے، فوج کا جرنل ہو سکتا ہے، کسی یونیورسٹی کا ڈین بن سکتا ہے وغیرہ وغیرہ۔ اس بات کا سیدھا مطلب یہ ہوا کہ ہم قرآن کے اس اصول کا انکار کر دیں کہ **ان اکرمکم عند اللہ اتقاکم** [بیشک اللہ کے نزدیک تم میں سے زیادہ عزت والا وہ ہے جو اللہ کے احکامات کا زیادہ لحاظ کرنے والا ہے: حجرات، ۱۳]۔ دوسرے لفظوں میں افراد چاہے مؤمن اور متقی ہوں یا کافر، منافق، بدکار، فاسق اور فاجر، الغرض ہر لحاظ سے معاشرتی صف بندی اور تعلقات کی درجہ بندی میں یکساں اہمیت اور درجات کے حامل ہیں اور انکی ان صفات عالیہ یا رزیلہ کا انکے معاشرتی احترام و درجہ طے ہونے سے کوئی تعلق نہیں ہونا چاہئے۔ اور ہم یہ محض کوئی نظریاتی بات نہیں کہہ رہے بلکہ آپ ترقی یافتہ جمہوری ممالک کا حال دیکھ آیئے کہ وہاں تقویٰ، حیا، خوف خدا، عشق رسول اور زہد وغیرہ جیسی مذہبی اقدار بالکلیہ مہمل اور لایعنی تصور کی جاتی ہیں۔ [اسی باعث پاکستان کے کافرانہ

آئین کو اسلامی بنانے کے لیے اور اراکین اسمبلی کے انتخاب میں صفات تقوی تلاش کرنے کے لیے آرٹیکل ۶۲ اور ۶۳ شامل کیے گئے تھے لیکن ان پر آج تک عمل نہیں ہوسکا نہ ہوسکتا ہے۔ جنرل ضیاء الحق کے عہد میں مدیر تکبیر محمد صلاح الدین نے ان دو آئینی شقوں کی بنیاد پر بعض امیدواروں کے کاغذات نامزدگی کو مسترد کرنے کی درخواستیں دائر کیں جو مسترد ہوگئیں اور عملاً یہ دونوں آئینی شقیں کبھی بروئے کار نہ لائی جاسکیں کیونکہ یہ دونوں شقیں کفر میں اسلام کا پیوند لگانے کی ناکام کوششیں تھیں یا کفر قبول کیا جائے یا اسلام دونوں میں مفاہمت مکالمہ ممکن نہیں سورہ کافرون اس ایمان کا واضح اعلان کرتی ہے کہ **لکم دینکم ولے الدین** ،ساحل] پس مذہب کو ذاتی مسئلہ قرار دینا درحقیقت خدائی اعلان **افنجعل المسلمین کالمجرمین** [کیا ہم فرماں برداروں کا حال مجرموں کا سا کریں گے: القلم، ۳۵] سے بغاوت ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ ایک بے نمازی شخص اسلامی ریاست میں صدر تو کجا صدر کا چپڑاسی بھی نہیں لگ سکتا کیونکہ دنیا کا ہر ادارہ اپنے چپڑاسی کی بھرتی کیلئے بھی کم از کم چند شرائط کا تعین کرتا ہے ایسے ہی ادائیگی نماز ان چند کم از کم شرائط میں سے ایک ہے جو اسلامی ریاست کی مشینری کے ذمہ داران کیلئے لازمی شرط کی حیثیت رکھتی ہے۔ مذہب ذاتی مسئلہ ہے کا مطلب یہ ہے کہ ہم ان تمام احادیث کا انکار کردیں جن میں آپ ﷺ نے ایسے ارشادات فرمائے مثلاً **خیرکم من تعلم القرآن وعلمه** [تم میں سے بہتر وہ ہیں جو قرآن سیکھیں اور سکھائیں] وغیرہ۔ اسکی وجہ یہ ہے کہ ان ارشادات کو ماننے کا واضح مطلب یہ ماننا ہے کہ معاشرے میں افراد کی درجہ بندی میں مذہبی اقدار حتمی حیثیت کی حامل ہیں اور یہ وہ بات ہے جو جمہوری اقدار [آزادی اور مساوات] نیز اس دعوے کہ مذہب ذاتی مسئلہ ہے کی عین ضد ہے۔

جمہوریت: الدین، منافقین اور کفار میں فاصلے ختم کرنے کی کوشش:

کفار منافقین اور رسول کے دشمنوں سے محبت قائم کرنے کی جدیدیت:

اسی بات کا دوسرا پہلو یہ ہے کہ معاشرہ افراد کے ان باہمی تعلقات کا نام ہے جو کسی مقصد کے حصول کی خاطر برضا و رغبت قائم کئے جاتے ہیں۔ مذہب کا ذاتی مسئلہ ہونے کا مطلب یہ ہے کہ تعلقات کی تشکیل و تعمیر میں مذہبی شناخت و اقدار کا کوئی کردار نہیں ہونا چاہئے۔ آسان لفظوں میں اس کی تفصیل یوں سمجھئے کہ لوگ تعلقات قائم کرتے ہوئے مذہبی شناخت و اخلاق حمیدہ کی صفات وغیرہ کو پس پشت ڈال دیں اور اس بات کی پرواہ نہ کریں کہ جس کے ساتھ انکا تعلق ہے وہ مسلمان، متقی، عابد وغیرہ ہے یا مرتد، کافر، منافق، بدکار، فاسق و فاجر ہے [اس کی وجہ یہ ہے کہ جمہوری معاشرہ درحقیقت ایک سول سوسائٹی ہوتی ہے جس میں تعلقات کی بنیاد خواہشات اور غرض ہوتی ہے جیسا کہ پچھلے مضمون میں تفصیلاً اس پر روشنی ڈالی گئی تھی]۔ اب ذرا اس بات کو قرآن مجید کی اس آیت کی روشنی میں پرکھئے جس میں ایک مؤمن کی شان یہ بتائی گئی ہے **قل ان صلاتی و نسکی و محیای و مماتی لله رب العلمین لا شریک له و بذالک امرت** [کہو کہ میری نماز، میری قربانی، میرا جینا، میرا مرنا

سب اللہ کیلئے ہے جو عالمین کا رب ہے [اور] جسکا کوئی شریک نہیں ہے اور مجھے تو اسی بات کا حکم دیا گیا ہے [کہ میں اسی کی ذات کو ہر چیز کا مرکز ومحور بنالوں]: انعام، ۱۶۲-۱۶۱]۔ایسے ہی قرآن مجید میں کئی آیات میں یہ بات کہی گئی ہے کہ کفار ومشرکین کو اپنا راز دان نہ بناؤ، نیز اگر تمہارے قریبی رشتہ دار بھی کفر اختیار کر کے اللہ اور اسکے رسول سے دشمنی کی روش برقرار رکھیں تو ان کو بھی محبوب نہ جانو [توبہ، ۲۳-۲۴]۔اسی طرح احادیث مبارکہ میں بھی اسی بات کو مختلف پیراؤں میں بیان کیا گیا ہے، جیسے ایک حدیث میں آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ ایمان کی حلاوت چکھ لی اس شخص نے جس نے اللہ ہی کیلئے دوستی اور دشمنی رکھی [بخاری]۔ایسے ہی یہ بات زیادہ وضاحت کے ساتھ ایک حدیث میں آپ ﷺ نے یہود کے خصائص بتاتے ہوئے یوں ارشاد فرمائی: ''**ان اول ما دخل النقص علی بنی اسرائیل انه کان الرجل یلقی الرجل فیقول یا هذا اتق الله ودع ما تصنع فانه لا یحل لک، ثم یلقاه من الغد وهو علی حاله فلایمنعه ذالک ان یکون اکیله و شریبه و قعیده، فلما فعلوا ذالک ضرب الله قلوب بعضهم ببعض ثم قال [لعن الذین کفروا الی قوله فاسقون]** [ترجمہ: بنی اسرائیل میں جو سب سے پہلا نقص پیدا ہوا وہ یہ تھا کہ ان میں سے جب ایک شخص دوسرے شخص سے ملاقات کرتا تو یہ کہتا تھا اے فلاں، اللہ کا تقوی اختیار کرو اور جو تم کر رہے ہو اس کو چھوڑ دو اس لئے کہ یہ تمہارے لئے جائز نہیں ہے۔پھر اسکی جب اسی شخص سے اگلے روز دوبارہ ملاقات ہوتی اور وہ شخص اپنے سابق حال پر قائم ہوتا تھا [یعنی اسی ناجائز کام کا ارتکاب کر رہا ہوتا تھا]، لیکن یہ چیز [یعنی دوسرے شخص کا اپنے سابق حال پر ہونا] مانع نہ ہوتی تھی اس [پہلے شخص] کے راستے میں کہ وہ اسکا ہم نوالہ وہم پیالہ اور ہم نشین بنے۔ جب انہوں نے یہ روش اختیار کی، تو اللہ نے انکے دلوں کو آپس میں مشابہہ کر دیا۔پھر آپ ﷺ نے قرآن کی آیات تلاوت فرمائیں''۔یہ ارشاد فرمانے کے بعد آپ ﷺ اٹھ کر بیٹھ گئے جبکہ اس سے پہلے ٹیک لگائے ہوئے تھے اور فرمایا ''**کلا والله لتامرن بالمعروف ولتنهون عن المنکر ولتاخذن علی ید الظالم ولتاطرنه علی الحق اطراً ولتقصرنه علی الحق قصراً او لیضربن الله بقلوب بعضکم علی بعض ثم لیلعنکم کما لعنهم** [ہرگز نہیں، خدا کی قسم تمہیں لازماً نیکی کا حکم دینا ہوگا، اور تمہیں لازماً بدی سے روکنا ہوگا، اور تمہیں لازماً ظالم کے ہاتھ کو قوت سے روک لینا ہوگا، اور اسے حق پر قائم رکھنا ہوگا، یا [دوسری صورت میں] اللہ تمہارے دل ایک دوسرے کے مشابہہ کر دے گا، پھر اللہ تم پر بھی لعنت فرمائے گا جیسے ان [یہود] پر لعنت فرمائی]۔اس سلسلے میں سب سے واضح بات یہ کہ ہمیں ہر روز عشاء کی نماز میں دہرائی جانے والی دعائے قنوت کو بھی تبدیل کرنا پڑے گا کیونکہ اس میں ایک مؤمن اپنے رب کے سامنے اس بات کا عہد واقرار کرتا ہے کہ **نخلع و نترک من یفجرک** [یعنی اے اللہ جو تیری نافرمانی کرتے ہیں ہم ان سے قطع تعلق کر لیتے ہیں]۔مذہب کو ذاتی مسئلہ بنانا درحقیقت یہ دعوی کرنا ہے کہ مذہبی اقدار کا تعلقات کی تشکیل اور اسکی درجہ بندی سے کوئی تعلق نہیں اور

یہ دعوی قرآن مجید واحادیث نبوی سے کھلی ہوئی بغاوت ہے۔

[۲] نیکی اور بدی برابر ہیں: اسی سے منسلک دوسرا نتیجہ یہ ہے کہ مذہبی احکام کی بجا آوری مہمل اور بے معنی چیزیں ہیں۔انکی نوعیت بالکل ایسی ہی ہے جیسے جمناسٹک، باڈی بلڈنگ یا کھیل تماشا کرنا۔اسکی وجہ یہ ہے کہ ایک جمہوری ریاست میں فرد کی نجی زندگی کی ترجیحات اسکے اجتماعی معاملات طے کرنے میں اصولاً کوئی اہمیت نہیں رکھتیں[گو کہ عملاً یہ دعوی بھی درست نہیں کیونکہ جمہوری ریاست میں وہی شخص آگے نکل پاتا ہے جو اپنی نجی زندگی کو بھی حرص وحسد ونفسانی خواہشات کی آماجگاہ بناتا ہو، جو دین کی علماً وعملاً تکذیب کرتا ہو اور دنیا ہی کو سب کچھ سمجھتا ہوں انتخابات میں کامیابی بھی عموماً انہی لوگوں کو ملتی ہے جو لوگوں کو سدھانے کا فن جانتے ہوں اور اوصاف رذیلہ میں طاق ہوں حتیٰ کہ مذہبی جماعتوں میں بھی جمہوری عمل کے ذریعے وہی لوگ آگے آتے ہیں جو تقویٰ و پرہیزگاری میں کم تر ہوتے ہیں۔مگر اس مضمون میں ہم اس پہلو پر بحث نہیں کریں گے]۔وہ اگر کسی یونیورسٹی کا استاد ہے، تو اپنی ذاتی زندگی میں چاہے تو جمناسٹک کلب جائے، کرکٹ کا تماشائی بنے، فلموں کا تماش بین بنے، شراب خانے جائے یا نماز پڑھے ان تمام باتوں کا اسکی اجتماعی زندگی کی ذمہ داریوں سے کوئی تعلق نہیں ہوتا۔ذاتی زندگی میں افراد کی خواہشات کی تمام ترجیحات مساوی طور پر بے معنی متصور کی جاتی ہیں۔ذاتی زندگی کی ترجیحات کی برابری کے اس تصور پر یقین رکھنے کے بعد بھی اگر کوئی شخص خود کو مسلمان سمجھتا ہے تو ہم نہیں جانتے کہ آخر کفر کیا ہے۔اس دعوے کا مطلب یہ ہوا کہ نیکی اور بدی دونوں ہی مہمل تصورات ہیں اور انکی کوئی حقیقت نہیں۔خیر وہ ہے جسے ایک فرد اپنے لئے خیر سمجھے، دوسرے لفظوں میں فرد کی خواہشات ہی خیر اور شر کا اصل منبع ہیں۔لہذا نیکی اور بدی بذات خود کوئی شے نہیں اور اپنی ذات کے اعتبار سے دونوں ہی مساوی قدریں ہیں۔اب ایک طرف قرآن کا یہ اعلان سامنے رکھئے کہ **لا تستوی الحسنة و لا السیئة** [نیکی اور بدی یکساں نہیں ہوسکتیں: حم سجدہ، ۳۴] اور دوسری طرف یہ دعوی کہ مذہب فرد کا ذاتی مسئلہ ہے، کیا اب بھی کوئی شخص اس غلط فہمی میں مبتلا ہوسکتا ہے کہ اسلام جمہوری مذہب ہے اور اسکا معاشرے اور ریاست سے کوئی تعلق نہیں ہونا چاہئے ؟ قرآن کی رو سے علم اور جہالت، ہدایت اور گمراہی، نیکی اور بدی ہرگز برابر نہیں ہوسکتے۔

[۳] رواداری[Tolerance] یا تضیع ایمان: مذہب کو فرد کا ذاتی مسئلہ قرار دینے کا لازمی تقاضا یہ بھی ہے کہ ہم یہ مان لیں کہ کسی بھی فرد کو مذہب کی بنیاد پر کسی دوسرے شخص کے عمل پر تنقید کرنے یا اسے تبدیل کر دینے کی خواہش رکھنے اور اسکے لئے جدوجہد کرنے کا حق حاصل نہیں۔یہاں تک کہ ایک باپ کو نماز کیلئے اپنے بچوں پر جبر کرنے کا حق حاصل نہیں ہوسکتا۔یہی وجہ ہے کہ جب شہر لاہور میں ہونے والی عورتوں کی حیاء باختہ میراتھن ریس کے خلاف دینی تحریکوں اور علماء کرام نے احتجاج کیا تو جدیدیت کے دلدادہ صدر مملکت صاحب نے یہ ارشاد فرمایا کہ جو میراتھن نہیں دیکھنا چاہتے وہ اپنا ٹی وی بند کرلیں، مگر انہیں دوسروں پر تنقید کرنے کا حق حاصل نہیں۔اس

رویے کا خوبصورت نام Tolerance ہے[جسکا ترجمہ غلط طور پر ''رواداری'' کرلیا گیا ہے] جسکا مطلب یہ ہے کہ جب تمام افراد کی ذاتی خواہشات کی ترتیب اور زندگی گزارنے کے طریقے مساوی ہیں، تو ہر شخص کیلئے لازم ہے کہ وہ دوسرے کی خواہشات کا احترام کرے اور اسے برداشت کرے۔ آزادی[Freedom] بحیثیت ایک سنہری قدر کے اصول پر معاشرتی تشکیل تبھی ممکن ہے جب افراد اظہار ذات کے تمام طریقوں کو یکساں اہمیت دیں اور انہیں برداشت کرنے کا مادہ پیدا کریں، یعنی ٹولرنس کا مظاہرہ کریں[Tolerance کے فلسفے کے تحت قائم ہونے والے معاشروں میں کس کس قسم کے اعمال اور اظہار ذات کے کن کن ممکنہ طریقوں کو برداشت کرنا پڑتا ہے اسکا اندازہ چند روز قبل ہونے والے ان دو واقعات سے لگائیں۔ امریکہ میں ایک عورت کو چوبیس گھنٹے میں کئی سو مردوں کے ساتھ بدکاری کا عالمی ریکارڈ بنانے کے 'اعزاز' میں انعام سے نوازا گیا۔ اسی طرح چند روز قبل امریکہ میں پانچ ہزار سے زیادہ مردوں اور عورتوں نے مکمل برہنہ حالت میں سڑکوں پر احتجاجی جلوس نکالا، یہ ہے ٹولرنس کا اصل مفہوم اور روح، **العیاذ باللہ من ذالک**]۔اب Tolerance کے اس خوش نما فلسفے کو اس حدیث مبارکہ کی روشنی میں پرکھئے جس میں آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا: **من رای منکم منکرا فلیغیرہ بیدہ فالم یستطع فبلسانہ فالم یستطع فبقلبہ فذالک اضعف الایمان** [تم میں سے جو کوئی بھی برائی دیکھے تو اسے چاہئے کہ اسے اپنے ہاتھ [یعنی طاقت] سے روک دے، اگر اسکی استطاعت نہیں رکھتا تو اپنی زبان سے ایسا کر دے، اگر اسکی استطاعت بھی نہیں رکھتا تو اپنے دل سے ایسا کر دے [یعنی تہہ دل سے اسے برا جانے اور اس بات کا پختہ تہیہ رکھے کہ جب کبھی زبان اور ہاتھ سے اسے روکنے کی استطاعت آجائے گی تو روک دوں گا]، اور یہ [یعنی دل سے اسے ایسا کرنا] تو ایمان کا سب کمزور ترین درجہ ہے: مسلم]۔تقریباً یہی بات زیادہ تاکیدی انداز میں آپ ﷺ نے یوں بھی ارشاد فرمائی: ''**ما من نبی بعثہ اللہ فی امۃ قبلی الا کان لہ من امتہ حواریون واصحاب یاخذون بسنتہ ویقتدرون بامرہ، ثم انھا تخلف من بعدھم خلوف یقولون ما لا یفعلون ویفعلون مالا یؤمرون، فمن جاھدھم بیدہ فھو مؤمن، ومن جاھدھم بلسانہ فھو مؤمن، ومن جاھدھم بقلبہ فھو مؤمن، ولیس وراء ذلک من الایمان حبۃ خردل** [مجھ سے پہلے اللہ نے جس امت میں کسی نبی کو مبعوث فرمایا تو اسکی امت میں ایسے حواری ہوتے تھے جو اسکی سنت کو مضبوطی سے تھامتے تھے اور اسکے حکم کی پیروی کرتے تھے، پھر ان [حواریوں] کے بعد ان کے ناخلف جانشین آجاتے تھے جو وہ کہتے تھے وہ کرتے نہیں تھے، اور کرتے وہ کام تھے جنکا حکم نہیں دیا گیا تھا۔ تو جو کوئی ایسے [ناخلف] لوگوں سے جہاد کرے گا اپنے ہاتھ سے پس سے وہ مومن ہے، اپنی زبان سے پس وہ مومن ہے، اپنے دل سے پس وہ مومن ہے، اور اسکے بعد تو رائی کے دانے کے برابر بھی ایمان نہیں ہے: مسلم]۔ان احادیث میں واضح طور پر ایسے شخص کے قلب سے ایمان کی نفی فرمائی گئی ہے جو دل سے بھی برائی کو برائی نہ سمجھتا ہو، اسے دیکھ کر اسکے دل میں

تکلیف اور رنج نہ ہو اور اسے ختم کر دینے کا ارادہ بھی نہ پیدا ہو۔ اسی طرح ایک صحابی نے جب ایمان کی نشانی پوچھی تو آپ ﷺ نے فرمایا کہ جب نیکی کرنے سے تجھے خوشی ہو اور برائی سے غم و رنج ہو تو تو مؤمن ہے۔ پس واضح ہوا کہ مذہب کو فرد کا ذاتی مسئلہ قرار دینا نیز فلسفہ ٹولرنس درحقیقت ایمان کی نفی کے مترادف ہے کیونکہ ٹولرنس کا مطلب ہے کہ میں یہ مان لوں کہ اول تو برائی کوئی شے ہی نہیں، اور اگر مجھے کوئی عمل اپنے تئیں برائی نظر آتا بھی ہے تو میں اسے برداشت کروں، نہ یہ کہ اسے روکنے کی فکر اور تدبیر کرنے لگوں۔ بلکہ جمہوری اقدار کا تقاضا تو یہ ہے کہ میں دوسرے شخص کے ہر عمل کو قابل قدر نگاہ سے دیکھوں، اگر وہ اپنی ساری زندگی بندروں کے حالات جمع کرنے پر صرف کر دے تو کہوں کہ 'واہ جناب کیا ہی عمدہ تحقیقی کام کیا ہے'، اسی طرح اس عالمی ریکارڈ یافتہ زانیہ کی صلاحیتوں کا اعتراف کروں وغیرہ۔ دوسرے لفظوں میں یہ دعوی کہ مذہب فرد کا نجی مسئلہ ہے اس دعوے کے مترادف ہے کہ درج بالا نوع کی تمام احادیث نیز قرآنی آیات جن میں اہل ایمان کو یہ حکم دیا گیا ہے کہ **یا ایھا الذین امنوا قو انفسکم و اھلیکم ناراً** [اے ایمان والو اپنے آپ کو اور اپنے اہل و عیال کو آگ سے بچاؤ :تحریم، ۶] نعوذ باللہ نا قابل عمل اور فضول تعلیمات ہیں۔

[۴] **مسئلہ آخرت بے کار سوال ہے:** معاشرتی صف بندی میں یہ سوال کہ 'افراد اس معاشرے میں زندگی بسر کرنے کے بعد جنت میں جائیں گے یا جہنم میں' ایک لایعنی سوال ٹھرتا ہے۔ دوسرے لفظوں میں یہ مسئلہ کہ آیا افراد کو معاشرے میں زیادہ نیکیاں اور کم گناہ کمانے کے مواقع میسر ہیں ایک بے کار سوال ہے۔ کیونکہ جونہی نیکی اور گناہ کا سوال اٹھایا جائے گا تو مذہب ذاتی زندگی سے نکل کر اجتماعی میدان میں آجاتا ہے۔ اسلامی نقطہ نگاہ سے معاشرتی صف بندی میں اصل اور فیصلہ کن سوال ہی یہ ہے کہ افراد کو جنت میں جانے کے مواقع زیادہ فراہم ہیں یا جہنم میں۔ اس بات کو ایک مثال سے سمجھنے کی کوشش کرتے ہیں۔ اکثر اوقات شادی وغیرہ یا کئی دوسری محافل میں دوران طعام بیٹھنے کا انتظام نہ ہونے کی وجہ سے شرکاء محفل کو کھانا کھڑے ہو کر کھانا پڑتا ہے۔ اب اگر کوئی شخص اس موقع پر یہ بات کہے کہ 'بہتر یہ تھا کہ بیٹھ کر کھانا کھانے کا انتظام ہوتا' تو لوگ طرح طرح کے فلسفے بکھارنے لگتے ہیں۔ ایک عام جواب یہ ہوتا ہے کہ 'بھائی بیٹھ کر کھانا فرض یا واجب تو نہیں ہے'۔ لیکن مسئلہ یہ نہیں کہ آیا یہ عمل فرض ہے یا واجب، بلکہ اصل مسئلہ تو یہ ہے کہ ایک اسلامی معاشرے کی ادارتی صف میں اس بات کا خیال رکھا جائے گا یا نہیں کہ آیا اس کے نتیجے میں لوگوں کو زیادہ نیکیاں کمانے کے مواقع میسر آئے یا کم؟ اگر ایک عمل کو کئی طریقوں سے کرنا ممکن ہے تو سوال یہ ہے کہ ان میں سے کونسا اختیار کیا جائے گا؟ ظاہر ہے مسلمان کیلئے بہتر طریقہ وہ ہے جس میں اپنے نبی ﷺ کی اتباع ہوتا کہ نیکیاں زیادہ کمائی جاسکیں کیونکہ یہ نیکیاں ہی تو وہ شے ہیں جو آخرت میں کامیابی کا اصل سامان ہیں۔ ایسے ہی اسلامی معاشرے میں نیکیوں کا فروغ اور گناہوں کا سد باب کرنا ہی تو ریاست کا بنیادی وظیفہ ہوتا ہے۔ قرآن میں اللہ تعالی نے اہل ایمان کی ایک نشانی یہ بتائی کہ **الذین ان مکنھم**

فی الارض اقاموا الصلوۃ واتو الزکوۃ و امروا بالمعروف ونھوا عن المنکر [یہ وہ لوگ ہیں جنہیں اگر ہم زمین میں اقتدار بخشیں تو وہ نماز قائم کریں گے، زکوۃ دیں گے، معروف کا حکم دیں گے اور منکر سے منع کریں گے: حج، ۴۱]۔ مذہب کو فرد کا نجی مسئلہ قرار دینے کا مطلب یہ اعلان کرنا ہے کہ مرنے کے بعد جنت و جہنم میں جانا بے کار کے سوالات ہیں، اس کے مقابلے میں اسلام میں سب سے اہم اور پہلا سوال ہی یہ ہے کہ مرنے کے بعد کوئی شخص کہاں جائے گا۔ لہٰذا جمہوریت کو اسلام کے ساتھ جوڑنا درحقیقت اسلام کی بنیادیں ڈھانے کے مترادف ہے۔ ہم پھر کہے دیتے ہیں کہ یہ محض نظریاتی باتیں نہیں، بلکہ دنیا میں جہاں جہاں بھی جمہوری اقدار [آزادی اور مساوات] کا فروغ ہوا، ان معاشروں کے افراد کی زندگیوں میں فکر آخرت اور مرنے کے بعد کی زندگی کا سوال بے کار ہوتا چلا گیا۔ ایک جمہوری ریاست کو اس بات سے کوئی تعلق نہیں ہوتا کہ افراد جنتیوں والے اعمال کر رہے ہیں یا جہنمیوں والے، اسے تو صرف ایک شے سے غرض ہوتی ہے اور وہ ہے آزادی یعنی سرمائے میں اضافہ۔ مقاصد کے اس عظیم اختلاف کے بعد بھی کوئی شخص اسلام سے جمہوریت کا تقاضا کیسے کر سکتا ہے؟

جدیدیت پسندوں کی ایک اہم دلیل یہ کام فرض تو نہیں ہے:

فرض اور واجب نہ ہونے کا اعتراض شیطانی فلسفہ ہے:

جملہ معترضہ کے طور پر 'یہ عمل فرض نہیں ہے' کے فلسفے پر بھی چند باتیں عرض کرنا ضروری ہیں کیونکہ آجکل دین پر عمل نہ کرنے کیلئے اسے ایک ہتھیار کے طور پر استعمال کیا جانے لگا ہے۔ وہ حضرات جو دین کے ہر عمل کو 'فرض نہیں ہے' کی کسوٹی پر پرکھتے ہیں ان سے یہ سوال پوچھنا چاہئے کہ کیا آپ اپنی زندگی میں سارے کام فرض ہی کرتے ہیں، نیز کیا معاشرے میں سارے فرض کام ہی کئے جاتے ہیں؟ مثلاً کیا نفیس اور مہنگے قسم کے برتنوں میں کھانا کھانا کوئی فرض ہے، کیا گھروں میں قالین، فرنیچر، فانوس اور ماربل کا فرش ہونا فرض ہے، کیا غسل خانوں میں ہزاروں لاکھوں روپے کا پتھر لگانا فرض ہے، کیا نئے ماڈل کی گاڑیوں میں سفر کرنا فرض ہے، کیا پرتکلف کھانوں کا اہتمام کرنا بھی کوئی ضروری امر ہے؟ آخر یہ اور ان جیسے کئی اور کاموں میں سے کونسا کام فرض ہے؟ تو جب ایسے تمام غیر فرض کام کئے جاتے ہیں کہ جنکا کوئی ادنی ثبوت نہ تو آپ ﷺ اور نہ ہی انکے اصحاب میں سے کسی کی زندگی میں نظر آتا ہے، تو یہ فرض کا فلسفہ صرف دین ہی کیلئے کیوں یاد آجاتا ہے؟ حقیقت یہ ہے کہ کوئی بھی معاشرہ محض 'فرائض' سے عبارت نہیں ہوتا، بلکہ ہر معاشرے اور تہذیب کی معنویت اسکی سنتوں اور مستحبات [وہ جو بھی ہوں] وغیرہ ہی میں مضمر ہوا کرتی ہے کیونکہ اسکی سنتیں اور مستحبات ہی اسکے فرائض کو تقویت بخشتے ہیں۔ وہ اس لئے کہ فرائض تو کم از کم (bare-minimum) مطلوبہ رویے کا نام ہوتا ہے، اور اگر معاشرے کے تمام افراد ہی سنتوں اور مستحبات کو ترک کر دیں تو ان کی جگہ کسی دوسرے نظام زندگی کی سنتیں اور مستحبات لے لیتے ہیں، اور پہلے نظام زندگی کے فرائض بھی رفتہ رفتہ بے معنی اعمال نظر آنے لگتے ہیں، جیسے ہم دیکھتے ہیں کہ سرمایہ دارانہ معاشروں

میں لوگوں کو نماز میں کوئی معنویت دکھائی نہیں دیتی اور یہ محض ایک رسمی واضافی عمل کی شکل اختیار کر لیتی ہے۔ چنانچہ آپ کسی کھانے کے شوقین شخص کے دسترخوان سے سلاد، اچار، رائتہ اور اس نوع کے دیگر لوازمات ختم کر دیجئے، اور پھر اس سے پوچھئے کہ اب کھانے میں کوئی مزہ ہے یا نہیں۔ غضب تو یہ ہے کہ کسی عمل کے فرض یا واجب نہ ہونے کا مطلب گویا یہ فرض کر لیا گیا ہے کہ وہ بے کار اور فضول عمل ہے جسکی کوئی خاص اہمیت نہیں [**العیاذ باللہ**]۔ بھلا ایک مؤمن اپنے رسول کریم ﷺ کے اس تاکیدی ارشاد پاک کے ہوتے ہوئے کہ **لا تحقرن من المعروف شیئا** [نیکی کے کسی بھی عمل کو ہرگز حقیر و کم تر نہ سمجھو] کیسے اس بات کا تصور کر سکتا ہے کہ کسی عمل کے فرض نہ ہونے کو اسکے ترک کرنے کا جواز بنالے؟ پس جاننا چاہئے کہ یہ 'فرض اور واجب نہیں ہے' کا فلسفہ درحقیقت ایک شیطانی وسوسہ ہے جو اسنے ہمیں ہمارے توشہ آخرت [نیکیوں اور دین] سے دور لے جانے کے لیے سوچ سمجھ کر جدیدیت پسندوں نے تراشا ہے۔ [اب بعض مذہبی حلقوں میں بھی یہی لہر دوسرے انداز سے چل نکلی ہے، اس میں ہرج کیا ہے؟ یہ جملہ فرض اور واجب نہیں ہے کا متبادل ہے، عیش وعشرت کی زندگی ادھار پر گھر اور گاڑی خریدنا، زندگی سے زیادہ سے زیادہ تمتع حاصل کرنے میں کوئی ہرج نہیں، ساحل] اللہ تعالیٰ ہمیں ایسے شیطانی وسوسوں سے محفوظ فرمائے۔

[۵] **ان گنت احکامات شریعت کا انکار:** معاشرتی وریاستی صف بندی سے مذہب کے اخراج کا مطلب ان بے شمار احکامات شریعت کا انکار ہے جنکا تعلق معاشرتی وریاستی صف بندی کے ساتھ ہے، جیسے ستر وحجاب، معاشی لین دین، جرم وسزا، خلافت و جہاد وغیرہ۔ ان احکامات کا انکار اتنی واضح گمراہی ہے کہ ان پر کلام کرنا بھی تضیع اوقات ہے۔ اس رویے پر سب سے بہتر تبصرہ خود قرآن مجید میں ان الفاظ میں موجود ہے **من لم یحکم بما انزل اللہ فاولئک هم الکافرون ، فاولئک هم الظالمون ، فاولئک هم الفاسقون** [جو لوگ اللہ کے نازل کردہ قانون کے مطابق فیصلہ نہ کریں وہی تو کافر ہیں، وہی تو ظالم ہیں، وہی تو فاسق ہیں: مائدہ، ۴۳۔۴۶]

فیصلہ آپ خود کر لیں: کیا اسلام اور جمہوریت کا کوئی جوڑ ہے؟

اسلام کو جمہوری مذہب اور اسے فرد کا نجی مسئلہ قرار دینے والے ایک لمحے کیلئے درج بالا گزارشات پر غور کرنے کے بعد اس بات کا فیصلہ کریں کہ وہ کس چیز کا دعویٰ کر رہے ہیں۔ دنیا کا ہر شخص جس میں ذرا بھی عقل ہو واضح طور پر سمجھ سکتا ہے کہ یہ دعوت کفر والحاد کی طرف بلانے کی مترادف ہے جس سے ثابت ہوا کہ نہ تو اسلام فرد کا نجی مسئلہ ہے اور نہ ہی اسلام جمہوریت کا حامی ہے۔ کسی دلیل کو رد کرنے کے اس طریقے کو proof by contradiction [یعنی دلائل کے تعارض سے دعوے کا ابطال ثابت کرنے] کا طریقہ کہتے ہیں جسکا حاصل یہ ہے کہ کسی دعوے کی تردید کیلئے دعوے اور اسکے مضمرات میں تضاد ثابت کر دیا جائے، یا اسکے مضمرات کا ناممکن الوجود ہونا ثابت کر دیا جائے۔ ہم نے دکھایا کہ اسلام کو جمہوری مذہب ماننے کے بعد مذہب فرد کا نجی مسئلہ بن کر رہ

جاتا ہے جسکے لازمی نتائج میں چند یہ ہیں کہ تقویٰ عزت کا معیار نہیں، احکامات اسلامی پر عمل لغو و بے معنی اعمال کی حیثیت رکھتا ہے، نیکی اور بدی کوئی مستقل قدریں نہیں بلکہ فرد کی خواہشات کی مرہون منت ہیں لہذا امر بالمعروف ونہی عن المنکر بلا جواز عمل کا نام ہے، مرنے کے بعد کامیابی اور ناکامی ایک بے کار سعی کے مترادف ہے، تمام احکامات شرعی جنکا تعلق معاشرے اور ریاست سے ہے ناقابل عمل ہیں وغیرہ وغیرہ۔ ظاہر بات ہے کہ اسلام اس قسم کے گمراہ کن تصورات سے یکسر خالی ہے۔ اب ہمارے سامنے دو راستے ہیں:

الف] یا تو آپ یہ مان لیں کہ اصلاً اسلام جمہوریت کا پرزور حامی ہے اور مذہب فرد کا نجی مسئلہ ہے، اس صورت میں آپ کو درج بالا تمام نتائج بھی اس دعوے کے ساتھ قبول کرنا ہونگے

ب] اور اگر آپ درج بالا نتائج کو اسلام کے منافی سمجھتے ہیں، تو پھر اس دعوے سے بھی دستبردار ہونا پڑے گا جس سے یہ لازمی نتائج برآمد ہوتے ہیں [یعنی یہ دعوی کہ اسلام جمہوریت کا حامی ہے اور مذہب فرد کا نجی مسئلہ ہے]

اب ہم یہ فیصلہ آپ پر چھوڑے دیتے ہیں کہ آپ ان میں کس راستے کو اختیار کرتے ہیں، اسلام کے یا جمہوریت کے۔ خوب سمجھ لیجئے کہ مذہب کو فرد کا ذاتی مسئلہ کہنے کے بعد ان نتائج سے مفر ناممکن ہے، یعنی یہ ممکن نہیں کہ میں اسلام کو جمہوری مذہب بھی کہوں، مذہب کو فرد کا ذاتی مسئلہ بھی قرار دوں اور اسکے بعد ان نتائج سے بچ نکلنے کی کوئی راہ نکال لوں۔ اگر کوئی شخص اس خیال میں مبتلا ہے تو اسکے لئے ہم اتنا ہی کہیں گے کہ ایں خیال است، محال است و جنوں۔

پرائیویٹ اور پبلک لائف کے تصور کی حقیقت

یہ دعوی کہ مذہب [اسلام] انسان کا ذاتی مسئلہ ہے کی صحت اس تصور پر قائم ہے کہ انسانی زندگی کی دو حیثیتیں یعنی پرائیویٹ اور پبلک لائف ہوتی ہیں، جبکہ اسلام کے نزدیک تو ذاتی اور پبلک لائف کی تفریق ہی ایک بے معنی تفریق ہے۔ اس اجمال کی تفصیل یہ ہے کہ پرائیویٹ اور پبلک لائف کی تفریق تصور آزادی سے نکلتی ہے، یعنی ایک ایسا شخص جو خود کو آزاد اور قائم بالذات تصور کرتا ہے اور جس کا مقصدِ زندگی خواہشات کی تکمیل ہو وہ اپنی زندگی کو دو حصوں میں بٹا ہوا دیکھتا ہے، ایک وہ گوشہ جہاں وہ اپنی ترجیحات کی جو ترتیب متعین کرنا چاہے کر سکتا ہے اور دوسرا وہ گوشہ جہاں اسے دوسرے افراد کے ساتھ تعلقات قائم کر کے اپنی خواہشات کی صرف وہی ترتیب متعین کرنے کی اجازت ہوتی ہے جس سے دوسروں کی خواہشات متعین کرنے کا حق مجروح نہ ہوتا ہو۔ اس بات کو آسان طریقے سے یوں سمجھئے کہ تصور آزادی جس سوال کی بناء پر پرائیویٹ اور پبلک لائف کی تقسیم پیدا کرتا ہے یا دوسرے لفظوں میں پرائیویٹ اور پبلک لائف کی تقسیم کے پیچھے جو سوال کارفرما ہے وہ یہ ہے کہ 'فرد اپنے اعمال کیلئے کس کے سامنے جواب دہ ہے' (to whom he is accountable)۔ چنانچہ اسکی زندگی کا وہ گوشہ جہاں

وہ اپنے اعمال کیلئے سوائے اپنے نفس کے اور کسی کے آگے جواب دہ نہیں ہوتا وہ اسکی پرائیویٹ لائف ہوتی ہے، اور وہ اعمال جنکے لئے وہ اپنے نفس کے علاوہ بھی کسی کے آگے جوابدہ ہوتا ہے [مثلاً معاشرے کے دوسرے افراد یا ریاست کا] وہ پبلک لائف کہلاتی ہے۔ انہی معنوں میں مذہب ایک شخص کا ذاتی مسئلہ ہے کیونکہ جمہوری تصور فرد کے مطابق وہ اپنے مذہب کیلئے سوائے اپنے نفس کے کسی اور کے آگے جوابدہ نہیں۔ اسلام میں ایسے کسی تصور کی کوئی گنجائش ہی نہیں، کیونکہ ایک شخص جو خود کو مسلمان کہتا ہو اس بات کا تصور بھی نہیں کرسکتا کہ اسکی زندگی کا کوئی گوشہ اور عمل ایسا بھی ہے جس کے لئے وہ اپنے رب کے حضور جوابدہ نہیں۔ اسلام کے مطابق انسان اپنے ہر عمل کیلئے اپنے رب کے سامنے جوابدہ ہے [نہ کہ اپنے نفس یا ریاست وغیرہ کے]، لہذا یہ سمجھنا کہ زندگی کا کوئی گوشہ ایسا بھی ہے جہاں میں جو چاہتا چاہوں چاہ سکتا ہوں ایک کافرانہ خیال ہے جس سے واضح ہوا کہ پرائیویٹ اور پبلک لائف کا تصور ہی ایک بے معنی تصور ہے۔ مجھے تو ہر حال میں اپنے رب کا حکم ماننا ہے، چاہے اس حکم کا تعلق میری تنہائیوں، خلوتوں، خیالوں اور حالات قلب سے ہو یا میری جلوتوں اور دنیاوی تعلقات سے۔ اپنے رب کے حکم کی بجا آوری بندے پر ہر حال میں لازم ہے، اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا کہ اسے حکم گھر میں تسبیح کرنے کا دیا گیا ہے یا اللہ کی حدود کو قائم کرنے کا۔ یہاں تو پرائیویٹ اور پبلک کا تصور ہی بے معنی ہے کیونکہ بندہ ہر حال میں اور اپنے ہر عمل کے لئے صرف اسی کے آگے جوابدہ ہے، لہذا وہ بنیادی تصور [کہ میں کس کے آگے جوابدہ ہوں] جس کی بنیاد پر پرائیویٹ اور پبلک لائف کی تفریق کا فلسفہ گھڑا گیا ہے اور جسکی بنیاد پر مذہب کو پرائیویٹ مسئلہ قرار دیا گیا ہے وہ تصور ہی اسلام کے نزدیک سرپا باطل ہے۔ مذہب کے ذاتی مسئلہ ہونے کا مطلب تو یہ ہوا گویا میں اپنی خلوتوں میں تو اپنے رب کا بندہ ہوں اور اسی کے سامنے جوابدہ ہوں، مگر اپنی جلوتوں میں کسی اور کا؟ دوسرے لفظوں میں اگر میرا رب مجھے **یبیتون لربھم سجداً و قیاما** کی نصیحت کرے گا تو میں مانوں گا، اور اگر اقیموا الدین یا چور کے ہاتھ کاٹنے کا حکم دے گا تو اسکے حکم کے بجائے کسی اور کے حکم کی تعمیل کروں گا۔ اب سیکولر حضرات ہمیں بتائیں کہ جس ریت کی بنیاد پر انہوں نے اپنی پوری عمارت تعمیر کی تھی، جب وہ بنیاد ہی نہ رہی تو عمارت کا کیا ہوگا؟ اسے کہتے ہیں نہ رہے گا بانس اور نہ بجے گی بانسری [لیکن سیکولر حضرات کی بانسری پھر بھی بجتی رہے گی کیونکہ اسے بجنے کے لئے دلیل کی نہیں بلکہ ریاستی طاقت کی ضرورت ہے جو اسے بدستور ملتی رہے گی یہاں تک کہ۔۔۔ **تلک الایام نداولھا بین الناس**]

[۲] سیکولر طبقے کی بے تکی تاویلات اور انکا تجزیہ

عقل وخرد کا حامل ہر شخص ہماری اس بحث کے بعد اسی نتیجے پر پہنچے گا کہ نہ تو اسلام جمہوری مذہب ہے اور نہ ہی یہ فرد کا نجی مسئلہ۔ لیکن کیا کریں اس مرعوبیت کا کہ جب کوئی شخص اسکا شکار ہو جاتا ہے تو اپنے دعوے کو ثابت کرنے کیلئے ہر گری پڑی تاویل کو بھی علمی دلیل سمجھنے لگتا ہے اور کچھ ایسا ہی رویہ سیکولر حضرات بھی اس معاملے

میں اختیار کرتے ہیں۔ اصل بات یہ ہے کہ ان حضرات کو نہ تو جمہوریت کی خبر ہے نہ ہی مذہب کی، اور نہ زیر بحث مسئلے کی اصل نوعیت کی۔ انہیں تو بس مغرب کی اندھی تقلید کا جنون سوار ہے اور اس مغربی تقلید کا ایک تقاضا یہ بھی ہے کہ مذہب کو نجی مسئلہ بنا دیا جائے۔ اس دعوے کے ایمان کش نتائج پر غور کر سکنے کی صلاحیت تو ایک طرف، ان مقلدین کو تو اتنی توفیق بھی نہیں کہ جس چیز کے وہ مدعی ہیں اسکی حقیقت اصل کتب ہی سے جان لیں یا نوعیت مسئلہ کو اس کے مافیہ و مالہ کے ساتھ سمجھ کر بیان کر سکیں۔ بس ادھر ادھر کی چند ثانوی کتب کے مطالعے سے یہ بات دل میں بٹھالی ہے کہ جمہوریت اور ہیومن رائٹس اچھی چیزیں ہوتی ہیں۔ سیکولر حضرات چونکہ خود کو مسلمانوں کی صفوں میں شمار کرتے ہیں اور یہ جانتے ہیں کہ جب تک وہ اپنے دعووں کیلئے اسلامی علمیت سے کوئی دلیل پیش نہیں کریں گے عام مسلمانوں کے نزدیک بھی انکی باتوں کی اہمیت مچھر کے پر جتنی نہیں ہوگی، تو وہ مسلمانوں کی تسلی کیلئے چند الٹی سیدھی تاویلات پیش کرتے ہیں جن میں سے چند ایک کا ہم ذکر کئے دیتے ہیں۔

۱.۲: کیا مدینہ ایک سیکولر ریاست تھی؟ سیکولر طبقہ لوگوں کو دھوکہ دینے کیلئے یہ بات مشہور کرنے کی کوشش کرتا ہے کہ مدینہ طیبہ میں آپ ﷺ نے ایک ایسا معاشرہ قائم کیا تھا جسکی بنیاد مذہب نہیں تھی۔ اس دعوے کی دلیل یہ پیش کی جاتی ہے کہ آپ ﷺ نے مدینے کی تمام اقوام و مذاہب کے ساتھ میثاق مدینہ کیا تھا جسکے مطابق ہر شخص کو مذہبی و معاشرتی آزادی حاصل تھی، اور ریاست کا تحفظ و دفاع تمام فریقوں کیلئے یکساں لازم تھا اور یہی سیکولرزم اور ملٹی کلچرل ازم کی اصل روح ہے۔ یہ دلیل علمی طور پر اسقدر لغو اور حقائق سے اتنی دور ہے کہ اسے رد کرنے پر اپنا وقت صرف کرنا بھی تضیع اوقات کے زمرے میں شمار ہوگا۔ علمی طور پر لغو اس لئے کہ مدینے کی ریاست کو سیکولر وہی شخص کہہ سکتا ہے جسے سیکولرزم کے معنی تک نہ معلوم ہوں۔ کیا کوئی شخص اس بات کا تصور کر سکتا ہے کہ وہ ذات اقدس جسے مبعوث کرنے کا مقصد ہی ادیان باطلہ کا قلع قمع کرنا اور حق کو باطل سے ممیز کرنا تھا، وہ ہستی ایک ایسے ناپاک معاشرے کو وجود بخشے گی جسکی بنیاد تقوی نہیں افراد کی خواہشات پر ہو، جس میں نیکی اور بدی اصولاً برابر ہوں، جس میں منکر کو پنپنے کے یکساں مواقع دے دیئے جائیں، جس میں افراد کی معاد کو پس پشت ڈال کر صرف معاش ہی کی فکر دامن گیر ہو، جہاں ان گنت احکامات شریعہ کو کالعدم اور باطل قرار دیا گیا ہو؟ بہت بڑی جسارت کرتا ہے وہ شخص جو اس بات کا مدعی ہے کہ آپ ﷺ کی ذات اقدس ایسے ناپاک معاشرے کی تشکیل کیلئے مبعوث کی گئی تھی کیونکہ یہ دعوی قرآن مجید اور احادیث کی ان گنت واضح نصوص کے خلاف ہے۔ ظاہر ہے کوئی مسلمان اس قسم کا دعوی کرنے کا سوچ بھی نہیں سکتا اور چونکہ ہمارے مخاطبین مسلمان ہیں، لہذا ہم امید رکھتے ہیں کہ وہ اس قسم کا لغو اور گمراہ کن دعوی ہرگز نہیں کر سکتے۔ یہ دعوی کہ مدینہ ایک سیکولر ریاست تھی حقیقت سے اتنا ہی دور ہے جتنا اس شخص کا دعوی جو امریکہ میں مسلمانوں کو نماز ادا کرتے نیز کچھ مسلمانوں کو امریکی فوج کی صفوں میں دیکھ کر یہ دعوی کر ڈالے کہ امریکہ اصلاً دارالاسلام ہے۔ ظاہر بات ہے اس مضحکہ خیز دعوے کا کوئی علمی جواب نہیں دیا

جانا چاہئے کیونکہ یہ دعوی ہی انتہائی درجے کی لاعلمیت اور جہالت کی غمازی کرتا ہے۔اس طرح کی بے تکی باتیں کرنے والے لوگ نجانے درج ذیل حقائق کو کس طرح نظرانداز کر دیتے ہیں:

[۱] ریاست کی سیادت وقیادت نیز تمام قسم کے جھگڑوں کی صورت میں حتمی فیصلے کا اختیار تاحیات حضور ﷺ کے ہاتھ میں تھا اور یہ فیصلہ معاہدے کے فریقوں کے مشورے یا ووٹ سے عمل میں نہیں آیا تھا۔[۲] اسی طرح ہم دیکھتے ہیں کہ آپ ﷺ کے وصال کے بعد بھی خلیفہ کے چناؤ کے مسئلے پر نہ تو کسی غیر مسلم سے مشورہ یا ووٹ مانگا گیا اور نہ ہی انکے کسی امیدوار کو اس منصب کیلئے زیر غور لایا گیا۔[۳] خلیفہ تو دور کسی غیر مسلم کو کسی صوبے کا گورنر یا والی وغیرہ بھی نہیں بنایا گیا اور نہ ہی انہیں کسی قسم کا کوئی اہم فیصلہ کن انتظامی نوعیت کا منصب دیا گیا۔[۴] پھر جب مختلف غزوات کے موقع پر یہودیوں نے معاہدے سے روگردانی کی تو آپ ﷺ نے انکے خلاف کاروائی کی اجازت لینے کے لیے کسی ایوان کے سامنے مسئلہ پیش نہیں کیا تھا، بلکہ اپنے ایماء پر یا تو انہیں مدینہ سے نکال باہر کیا یا پھر جہنم واصل کر دیا۔آخر کس جمہوری سیکولر ریاست میں ایسا کرنا ممکن ہے کہ ریاست کا والی اپنے ایماء پر شہریوں کے قتل عام یا انکے انخلاء کا فیصلہ کر لے۔[۵] مدینہ کی ریاست میں ایسے اسلامی احکامات کا اجراء ہوتا تھا جنکا تعلق افراد کے گروہ سے ہے، مثلاً سود لینا اور دینا حرام تھا، جرائم پر حدود کا نفاذ ہوتا تھا [حضرت ماعز اسلمی رضی اللہ عنہ پر حد زنا کا اجراء مدینے ہی میں ہوا تھا] وغیرہ وغیرہ۔[۶] حقیقت یہ ہے کہ میثاق مدینہ ایک دفاعی اور انتظامی نوعیت کا معاہدہ تھا جس کا مقصد ابتدائی دور میں مسلمانوں کی عسکری قوت کم ہونے کی بناء پر مدینے کی ریاست کو کفار سے بچانے کیلئے دوسری اقوام کو بھی اسکے دفاع میں شامل کر لیا گیا تھا۔یہی وجہ ہے کہ کسی بھی بیرونی غزوے [جیسے غزوہ تبوک] کے موقع پر مسلمانوں کے سوا کسی دوسرے فریق کیلئے اس میں شرکت لازم نہیں تھی، اور نہ ہی غزوے کے آغاز سے پہلے ان فریقین کی رائے یا اجازت لی جاتی تھی کہ ایسا کریں یا نہ کریں۔ ظاہر سی بات ہے کہ روم جیسی طاقتور ریاست سے رسہ کشی کا مطلب مدینہ کو خطرات سے دوچار کرنے کے مترادف تھا اور بالفرض اگر مدینہ ایک جمہوری ریاست ہوتا جہاں تمام اقوام کو برابر حقوق حاصل ہوتے تو ان اقوام کو مسلمانوں کے اس فیصلے پر یقیناً اعتراض ہوتا کہ تم لوگوں کے اس عمل سے ہمارا جینا دشوار ہو جائے گا، لہذا ہم تمہیں ایسا کوئی کام کرنے کی اجازت نہیں دیں گے جس سے مدینے کی سالمیت کو خطرہ ہو وغیرہ[۷] نتیجے کے اعتبار سے بھی دیکھا جائے تو صاف نظر آتا ہے کہ مدینے کی ریاست قائم ہونے کے بعد رفتہ رفتہ اسلامی حکومت شرق وغرب میں پھیل گئی اور آسمان دنیا نے کفار کے حوالے سے **حتی یعطوا الجزیۃ عن یدا وھم صاغرون** کی کیفیت کا نظارہ دیکھ لیا۔اب بتایئے، کیا آج تک کسی جمہوری ریاست کے قیام اور بقاء کے نتیجے میں مذہب کا بول بالا ہوا ہے؟ ہم تو یہ دیکھتے ہیں کہ جمہوری ممالک میں طرح طرح کے حربوں سے مذہب کو معاشرتی صف بندی سے خارج کر دیا جاتا ہے اور اس پر عمل کرنے کا دائرہ کار آہستہ آہستہ سکڑتا چلا جاتا ہے[۸] سب سے بڑی بات یہ کہ اگر اس

معاہدے کے مندرجات کا کھلی آنکھوں کے ساتھ مطالعہ کرلیا جائے تو بھی یہ اس امر میں کوئی شک نہیں رہ جاتا کہ یہ کوئی جمہوری قسم کا معاہدہ ہرگز نہیں تھا۔ مثلاً معاہدے کے ابتدائی الفاظ اس طرح ہیں **ھذا کتاب من محمد النبی [رسول اللہ ﷺ]** 'یہ دستاویز نبی محمد [ورسول اللہ ﷺ] کی طرف سے ہے'۔ اس جملے کا ایک ایک لفظ اس معاہدے کی نوعیت کی گواہی دے رہا ہے۔ سب سے پہلے تو اسکا انداز بیان ہی حاکمانہ ہے، یعنی جیسے ایک شاہی فرمان ہو، پھر یہ فرمان محمد عبدالمطلب نہیں بلکہ محمد رسول اللہ ﷺ کی طرف سے دیا گیا ہے اور ظاہر بات ہے کہ محمد رسول اللہ ﷺ کی حیثیت کسی جمہوری حاکم کی نہیں کہ جسے لوگوں نے چنا ہو اور جسکے حکم سے انحراف کرنا ممکن ہو۔

ان حقائق کو منہ چڑھا کر بھی اگر کوئی شخص مدینہ کو ایک سیکولر ریاست ہی کہتا پھرے تو اسے آنکھوں میں دھول جھونکنا نہ کہیں تو اور کیا کہیں؟ ایسے شخص کو پھر اس سوال کا جواب بھی دینا ہوگا کہ آخر امریکہ دارالاسلام کیوں نہیں؟

۲.۲: کیا اسلام ملٹی کلچرل [کثیر المعاشرتی] نظام کا حامی ہے؟

مغربی اصطلاحات کے غلط سلط ترجمے کا نتیجہ:

اوپر اس بات کا ذکر کیا گیا تھا کہ جدیدیت پسندوں کا ایک مسئلہ ہر مغربی تصور کو سمجھے بغیر ہی اسے اسلامی تاریخ میں تلاش کرنے اور اسلام پر چسپاں کرنے کا جنون ہے، چاہے اس جنون کی تسکین کیلئے انہیں کتنی ہی لغو تاویلات کیوں نہ کرنا پڑیں۔ یہ بات ہر ذی علم شخص جانتا ہے کہ کسی علمیت سے نکلنے والی اصطلاحات کا نہ تو ترجمہ ممکن ہوتا ہے اور نہ ہی اس اصطلاح کو اسکے تاریخی اور علمی پس منظر کے بغیر سمجھنا ممکن ہوتا ہے۔ بہت ظلم کرتا ہے وہ شخص جو اصطلاحات کو اسکے اصل پس منظر سے ہٹا کر اسے اپنے من مانے مفہوم پہنا کر استعمال کرتا ہے۔ مثلاً جب لفظ Enlightenment کی بات نکلی تو بعض 'اہل علم' نے کہا کہ جناب یہ تو بہت اچھی چیز ہے۔ جب پوچھا گیا کیسے، تو جواب ملا کہ دیکھئے اس لفظ کا مطلب ہے 'روشن خیالی'، اور لفظ 'روشن' اور 'خیال' دونوں ہی اچھے معنی میں استعمال ہوتے ہیں، لہذا ثابت ہوا کہ Enlightenment اچھی چیز ہے۔ اس قسم کے طفلانہ افکار کی بہترین عکاسی دیکھنا مقصود ہو تو ڈاکٹر فاروق خان صاحب [جو درحقیقت غامدی صاحب کے ہی نظریات کا پرچار کرتے ہیں] کی کتب [مثلاً 'جدید ذہن کے شبہات اور اسلام کا جواب'] ملاحظہ فرمائیں جنہیں پڑھ کر اندازہ ہوتا ہے کہ موصوف جدید ذہن کی مبادیات تک سے واقف نہیں لیکن اسکے سوالات کے جوابات دینے کی فکر انہیں دامن گیر ہو چلی ہے۔ چند روز قبل لفظ روشن خیالی پر ڈاکٹر شکیل اوج صاحب کا ایک 'فکری و تحقیقی' مضمون نظر سے گزرا، مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اس کے چند اقتباسات یہاں نقل کر کے قارئین کو دکھایا جائے کہ ہمارے مفکرین [جو اسلاف پر تنقید کرنے میں کوئی دقیقہ نہیں اٹھا چھوڑتے] مغربی اصطلاحات کو اسلامیانے کیلئے کیسا غیر علمی طرز

عمل اختیار کرتے ہیں۔ چنانچہ موصوف اپنے مضمون کی ابتداء اس بلند و بانگ دعوے سے فرماتے ہیں: ''یہ حقیقت ہے کہ جو معاشرہ وحی الٰہی کی روشنی میں تشکیل پاتا ہے وہ ایک روشن خیال اور اعتدال پسند معاشرہ ہوتا ہے۔ حضور ختمی مرتبت ﷺ نے اپنے کردار و عمل کے ذریعے اتباع وحی میں بالفعل ایسا ہی معاشرہ تشکیل دیا تھا۔'' اب اس روشن خیالی کی تشریح بھی موصوف کی اپنی ہی زبانی سنئے، ذرا آگے چل کر روشن خیالی کی وضاحت کرتے ہوئے لکھتے ہیں: ''روشن خیال فارسی زبان کا لفظ ہے، روشن کے معنی ہیں تاباں، منور و درخشاں، نیز صاف واضح اور عیاں [علمی لغت] اور خیال کے ساتھ 'روشن' کی اضافت کے ساتھ اس کا مطلب ہوا واضح، صاف اور منور خیال'' [التفسیر سہ ماہی، اپریل/مئی/جون ۲۰۰۵: ص۳-۴]۔ اب اس تحقیق کو لطیفہ نہ کہیں تو اور کیا کہیں؟ ایسا ہی ایک اور علمی شگوفہ وحید الدین خاں صاحب کے اعلیٰ افکار سے بھی سنتے چلئے [خیال رہے کہ آپ جناب اپنے تئیں خود کو عالم اسلام کا سب سے بڑا مفکر و جدید افکار شناس سمجھتے ہیں]۔ چنانچہ موصوف لکھتے ہیں: ''موجودہ زمانے کے اسلام پسند لوگ سیکولرزم کو اسلام کا دشمن نظریہ سمجھتے ہیں اور غیر ضروری طور پر اسکی مخالفت کرتے ہیں، حالانکہ یہ عین صلح حدیبیہ کے مثل ایک واقعہ ہے۔۔۔ یہ صورت حال گویا ابدی صلح حدیبیہ ہے'' [الرسالہ، فروری ۱۹۹۰: ص۴۱]۔ ہم کہتے ہیں کہ اگر کوئی شخص غامدی صاحب کی طرح لفظ 'سنت' کے اصل اسلامی تصور کے بجائے فرض کریں اسکے لغوی معنی کو بنیاد بنا کر اپنی طرف سے کوئی مفہوم متعین کر کے عام گفتگو میں اسے استعمال کرنے لگے تو کیا یہ بات علمی دیانت کے خلاف نہ ہوگی؟ اسی طرح فرض کریں کوئی شخص اسلامی اصطلاح 'اصول فقہ' کا ترجمہ سمجھ بوجھ کے اصول [کیونکہ اردو میں فقہ کا لغوی معنی سمجھ بوجھ وغیرہ ہیں] یا انگریزی میں rules of understanding کر لے اور پھر اسے سائنس کے طریقہ علم پر یہ کہہ کر چسپاں کرنے لگے کہ دیکھو اس کے بھی تو rules of understanding یعنی سمجھ بوجھ کے اصول ہیں تو کیسا رہے گا؟ اس رویے کی سب سے واضح مثال دیکھنا ہو تو بیچارے لفظ 'جہاد' کے ساتھ ہونے والے سلوک کو دیکھئے۔ اس لفظ کو [جو درحقیقت ایک خاص اسلامی اصطلاح ہے] اسکے اصطلاحی مفہوم سے ہٹا کر اسکے لغوی معنی [جدوجہد کرنا] کی بنیاد پر کہاں کہاں استعمال نہیں کیا جاتا: مہنگائی کے خلاف جہاد، بے روزگاری کے خلاف جہاد، جہالت کے خلاف جہاد یہاں تک کہ مچھر، ملیریا اور پولیو کے خلاف بھی جہاد وغیرہ۔ اور تو اور آجکل تو گانے بجانے والے میراثیوں نے بھی اپنی ناچ گانے کی کمائی سے بیماریوں اور غربت وغیرہ کے خلاف جہاد شروع کر رکھا ہے۔

ہر شخص سمجھ سکتا ہے کہ یہ ایک انتہائی غیر علمی اور خطرناک حرکت ہے، مگر یہی وہ حرکت ہے جسے ہمارے مفکرین حضرات ایک عرصے سے دہراتے چلے آرہے ہیں۔ کسی اصطلاح کی تاریخی اور علمی تحقیق کئے بغیر ہی اسکا ترجمہ کر کے اسکے بارے میں ایک خود ساختہ تصور قائم کر لیتے ہیں اور پھر اس فرضی مفہوم کو بنیاد بنا کر کسی نہ کسی طرح اسے اسلام سے ثابت کر دکھایا جاتا ہے، اور ایسا کرتے وقت یہ سوچنے کی زحمت بھی گوارہ نہیں کی جاتی

کہ اسلام میں اس مغربی پیوندکاری کی ضرب اسلام کی کن کن تعلیمات کو کالعدم قرار دے گی۔ یہ بات جتنی اہم ہے ہمارا اہل علم طبقہ اس سے اتنی ہی غفلت برتتا ہے، لہذا ہم اس نقطے کی اہمیت واضح کرنے کیلئے پہلے لفظ 'فقہ' کی مثال آگے بڑھاتے ہیں اور پھر اپنے نفس مضمون کی طرف واپس لوٹتے ہیں۔ 'فقہ' اور 'اصول فقہ' محض عربی زبان کے الفاظ ہی نہیں بلکہ اسلامی علمیت سے نکلنے والی اصطلاحات ہیں اور کسی بھی دوسری زبان میں انکا ترجمہ کرنے سے انکے معنی کی وہ وسعت و جامعیت جاتی رہتی ہے جو ان الفاظ میں پائی جاتی ہے۔ مثلاً عام طور پر فقہ کی تعبیر اردو زبان میں لفظ 'قانون' اور انگریزی میں Law کے لفظ سے کی جاتی ہے۔ مگر یہ تعبیر انتہائی ناقص ہے کیونکہ عام طور پر قانون اس ضابطے کو کہتے ہیں جو کسی حکمران نے مقرر کیا ہو اور عدالتیں اپنے مقدمات کا فیصلہ ان ضوابط کے مطابق کرتی ہوں۔ دوسرے لفظوں میں ایسے سرکاری ضابطے کو قانون کہتے ہیں جو عدالتوں کے ذریعے حکومتی منظوری سے نافذ ہو۔ اس کے مقابلے میں فقہ کا تعلق انسانی زندگی کی پیدائش سے لیکر موت تک کی جانے والی ہر ارادی سرگرمی سے ہے، جس میں طہارت اور بستر پر آرام کرنے سے لیکر جرم و سزا نیز ریاست و جہاد تک کے مسائل شامل ہیں۔ الغرض یہ کہ انسانی زندگی کا کوئی گوشہ ایسا نہیں جو فقہ کے دائرہ عمل میں نہ آتا ہو اسکے مقابلے میں قانون کے دائرے میں ہماری روزمرہ سرگرمیوں کا بہت ہی تھوڑا سا حصہ آتا ہے [اور وہ بھی تب کہ جب عدالتوں اور کچہریوں میں جانے کی نوبت آئے]، جس سے معلوم ہوا کہ جس چیز کو قانون یا Law کہتے ہیں وہ درحقیقت فقہ کے کثیر ابواب میں سے ایک چھوٹا سا باب ہے۔ چنانچہ فقہ کیلئے قانون یا law کا لفظ استعمال کرنا ایک محدود شے کو لامحدود پر منطبق کرنے کے مترادف ہے۔ اس مثال سے یہ واضح کرنا مقصود تھا کہ ایک اصطلاح کا کسی دوسری زبان میں لغوی ترجمہ کرکے اسکا مفہوم متعین کرنا تو ایک طرف، کسی دوسری زبان میں اسکے اصطلاحی مفہوم کا ترجمہ اور تعبیر بیان کرنا بھی ایک غیر دانشمندانہ علمی رویہ ہے، جسکی وجہ یہ ہے کہ اصطلاح کے معنی ایک تہذیب کی علمی تاریخی سے گذرنے کے بعد متعین ہوتے ہیں اور کسی دوسری زبان میں اسکا ترجمہ یا مفہوم بیان کرنے سے اسکی علمی تاریخ و معنی، نیز اس تہذیب میں اسکا کردار وغیرہ پس پردہ چلے جاتے ہیں۔ اب ہم ملٹی کلچرل ازم کے مفہوم کی وضاحت کرتے ہیں۔

ملٹی کلچرل ازم کا اصل مفہوم

ملٹی کلچرل ازم ۱۹۷۰ اور ۸۰ کی دہائیوں میں مغربی ممالک میں ابھرنے والی نئی فکر ہے جو پس جدیدی (post-modern) فلسفے کی جدیدیت پر تنقید کا منطقی نتیجہ ہے۔ یہ فلسفہ مغرب کے آزاد تصور انسان کو درست تصور کرتے ہوئے اسے مفروضے کے طور پر لیتا ہے، یعنی اسکی علمی بنیادیں آزادی [Freedom] کے مغربی تصور پر قائم ہیں۔ [فریڈم ایک اصطلاح ہے جس کا ترجمہ آزادی اس اصطلاح کی اصل روح اور مابعد الطبیعیات کی عکاسی نہیں کرتا بعض لوگوں نے اس کا ترجمہ مادر پدر آزادی کیا ہے لیکن یہ بھی نامکمل ترجمہ ہے۔ اردو میں اس اصطلاح

کا ترجمہ ممکن نہیں لہٰذا مجبوراً آزادی جیسا معروف لفظ استعمال کیا جارہا ہے، ساحل]اس فلسفے کی بنیادی دعوت کو ہم اختصار کے ساتھ چند نقاط کی صورت میں بیان کرتے ہیں:

[۱] ہر فرد اور گروہ کا یہ مساوی اخلاقی حق ہے کہ وہ جیسے چاہے زندگی گزارے اور خیر اور شر کے جو پیمانے طے کرنا چاہے کرلے [۲] خواہشات کی کسی ایک ترتیب کو کسی دوسری ترتیب پر فوقیت اور ترجیح دینے کی کوئی عقلی دلیل موجود نہیں، لہٰذا سب کو پنپنے کے مساوی مواقع ملنا چاہئیں [۳] اس لحاظ سے زندگی گزارنے کے تمام طریقے اور تمام شناختیں [مثلاً مسلم و کافر، امریکی و افغانی، سندھی و بلوچ وغیرہ وغیرہ] عقلاً و اخلاقاً مساوی حیثیت کی حامل ہیں اور ان میں سے کسی کو کسی دوسرے پر ترجیح دینے کی کوئی علمی بنیاد موجود نہیں۔ [۴] لہٰذا تمام افراد اور گروہوں کو اپنے اپنے شناختی اختلافات قائم رکھتے ہوئے دوسروں کی خواہشات کا تہہ دل سے احترام کرنا اور اسے برداشت کرنا چاہئے، اور یوں سب لوگوں کو ٹولرنس کا مظاہرہ کرکے مل جل کر رہنا چاہئے [جسے وہ خوبصورت پیرائے میں یوں ادا کرتے ہیں کہ we should enjoy differences]

ملٹی کلچرل ازم کے فروغ کی پالیسیاں: ملٹی کلچرل ازم کے فروغ کے سلسلے میں درج ذیل نوعیت کی پالیسیاں اور ہتھکنڈے استعمال کئے جاتے ہیں

[۱] کثیر قومیت (multi-nationalism) کو فروغ دینا یعنی ایک شخص کو بیک وقت ایک سے زیادہ ملکوں کی شہریت رکھنے کی اجازت دینا

[۲] اقلیتی طبقوں کے مذہبی تہواروں اور چھٹیوں وغیرہ کو ریاستی سطح پر منانے کا اہتمام کرنا تاکہ انہیں بھی مساوی اہمیت کا احساس ہوسکے

[۳] اقلیتی طبقوں کے افراد کو ملکی سطح پر موسیقی اور کھیل تماشوں وغیرہ میں شرکت کے مواقع فراہم کرنا

[۴] سیاسی عمل میں اقلیتی طبقوں کا حصہ بڑھانا

[۵] تمام مذاہب کے مذہبی لباس وغیرہ کو تعلیمی اداروں میں عام کرنے کی کوشش کرنا

[۶] تعلیمی نظام کو ایسی تمام تعلیمات سے پاک کردینا جو صرف کسی ایک ہی مذہب کو حق کے طور پر پیش کرتی ہوں

[۷] بین المذاہب مکالموں کو فروغ دینے کی کوشش کرنا وغیرہ وغیرہ

ملٹی کلچرل ازم کے تباہ کن منطقی نتائج:

خیر و شر کی بحث کا خاتمہ:

المختصر اس فلسفے کا دعوی ایک ایسے معاشرے کا فروغ ہے جہاں تمام 'ہیومنز' ایک دوسرے کے ساتھ رہ سکیں۔ بظاہر یہ تصور جتنا خوشنما دکھائی دیتا ہے حقیقت میں اتنا ہی خطرناک ہے۔ یہ فلسفہ اس مفروضے پر

قائم ہے کہ خیر اور شر کوئی حقیقی شے نہیں اور نہ ہی انہیں جاننے کا کوئی علمی پیمانہ اور ذریعہ موجود ہے، بلکہ یہ محض ہماری خواہشات کی عکاس ہیں، یعنی خیر وہ ہے جسے کوئی فرد یا گروہ اپنے لئے خیر سمجھتا ہے۔ اسے ماننے کا مطلب یہ ہے کہ ہم یہ مان لیں کہ:

[۱] انسان عبد نہیں بلکہ خود اپنا خدا ہے، کیونکہ انسان کو خیر و شر طے کرنے کا حق دینے کا مطلب اس بات کا انکار ہے کہ وہ عبد ہے [آزادی کا مطلب 'عبدیت' کا رد ہی ہے]

[۲] اللہ تعالی نے انسان کو خیر و شر بتانے کیلئے ہدایت کا کوئی سلسلہ انبیاء کرام کے ذریعے قائم نہیں کیا، نیز انبیاء کرام کی تعلیمات خیر و شر طے کرنے کا کوئی حتمی معیار نہیں ہیں بلکہ خیر و شر تو انسان خود طے کرے گا اور ہر شخص کا تصور خیر مساوی حیثیت رکھتا ہے [مساوات کا معنی 'نظام ہدایت' کا انکار ہی ہے]

[۳] زندگی میں انسان کا مقصد اپنے ارادے اور خواہشات کی زیادہ سے زیادہ تکمیل ہے، اور ارادہ انسانی کی یہی تکمیل ترقی کا اصل حاصل ہے [ترقی کا معنی 'آخرت' کا اور دنیا کے 'دارلامتحان' ہونے کا انکار ہے]

[۴] اس کائنات میں میری لامحدود خواہشات کی تکمیل کیلئے ضروری ہے کہ تمام اشیاء و موجودات میرے ارادے کے تابع ہو جائیں، لہذا علم سے مراد وہ بات جاننا ہے جس کے ذریعے میں اس چیز پر قادر ہو جاؤں کہ میرے ارادے کی تکمیل کیسے ہو سکتی ہے اور وہ علم جو مجھے یہ بتاتا ہے کہ کائنات پر میرے ارادے کا تسلط کیسے ممکن ہے اسے جدید سائنس [Modren Science] کہتے ہیں [سائنس کی حقیقت و ماہیت کیلئے ہمارا تفصیلی مضمون ساحل نومبر ۲۰۰۶ کے شمارے میں دیکھئے]۔ لہذا ترقی کا اصل معنی ہے علم کو سائنس کے ہم معنی قرار دینا، یعنی ترقی سے مراد اس علم میں اضافہ ہے جو میرے ارادے کی تکمیل کو ممکن بناتا ہو۔ یہی وجہ ہے کہ مغربی تہذیب میں علم وہ چیز جاننا نہیں ہے کہ جس سے میں اپنے رب کی رضا جان لوں، یعنی علم یہ نہیں کہ مجھے وضو یا غسل وغیرہ کرنے کا طریقہ اور مسائل معلوم ہو جائیں بلکہ علم تو یہ ہے کہ میں یہ جان لوں کہ پنکھا کیسے چلتا ہے، بجلی کیسے دوڑتی ہے، جہاز کیسے اڑتا ہے وغیرہ وغیرہ۔ اور تمام مسلمان جدیدیت پسند حضرات بھی قرآن وسنت کے علم کو کوئی خاص اہمیت نہیں دیتے بلکہ ان کے نزدیک اصل علم سائنس وٹیکنالوجی ہی کا علم ہے [جدید سائنس کا معنی 'وحی کے علم ہونے' کا انکار ہے]

[۵] اسلام ہی واحد حق نہیں ہے بلکہ تمام مذاہب اور نظریہ ہائے زندگی بھی اتنے ہی حق پر مبنی ہیں جتنا اسلام، لہذا مسلمانوں کو اسلام کی دوسرے مذاہب اور نظام ہائے زندگی کے برتری کے دعوے سے دستبردار ہو جانا چاہئے اور اقامت دین اور اشاعت وتبلیغ دین کی کوششیں ترک کر دینی چاہئیں کیونکہ اسی مذہبی برتری کی سوچ کے نتیجے میں مذہبی انتہا پسندی کو فروغ ملتا ہے۔ چنانچہ اسی فکر سے متاثر ہو کر وحید الدین خاں اور انکے فکری ہمنوا جاوید احمد غامدی صاحب افضلیت بین الانبیاء اور اسلام کی دوسرے مذاہب پر کاملیت کے اعتبار سے برتری وغیرہ کے

اجماعی مسائل کے خلاف عوام الناس کے دلوں میں وسوسے پیدا کرتے چلے آرہے ہیں

ملٹی کلچرل ازم سرمایہ داری کی بالادستی کا نام ہے: کیا عبدیتِ انسانی، رسالت، آخرت اور اسلام ہی کے حق ہونے کے انکار کے بعد بھی کوئی ایسی شے بچتی ہے جسے ہم اسلام کہتے ہیں؟ ہر شخص خود بھانپ سکتا ہے کہ ملٹی کلچرل ازم کس عظیم گمراہی کا نام ہے۔ خود مغرب میں بھی اس فلسفے کے سخت ناقدین موجود ہیں کیونکہ یہ فلسفہ تو خود مغربی تہذیب کے اپنے بارے میں بلند و بانگ دعووں کو مٹی میں ملا دیتا ہے۔ اس اجمال کی تفصیل یہ ہے کہ اگر یہ مان لیا جائے کہ تمام کلچرز اور زندگی گزارنے کے تمام طریقے برابر ہیں اور کسی کو کسی پر ترجیح نہیں دی جاسکتی تو پھر سوال یہ ہے کہ ایک ایسا کلچر جو آزادی، ترقی اور سائنس وغیرہ کو فروغ دیتا ہو وہ کیونکر کسی ایسے کلچر سے بہتر قرار دیا جا سکتا ہے جہاں ان اقدار کی کوئی حیثیت نہ ہو؟ اس فلسفے کے مطابق تو مغربی مفکرین کے دور وسطی کے یورپ کے بارے میں کئے گئے Dark ages کے سارے دعوے جھوٹے اور بے بنیاد قرار پاتے ہیں، اور اگر آج کوئی فرد یا گروہ سائنس اور ترقی کو رد کر کے یورپ میں پھر وہی کلچر عام کرنا چاہے جو دور وسطی میں پایا جاتا تھا تو اس فلسفے کے مطابق اس شخص کی خواہشات بھی اتنی ہی اہمیت کی حامل ہیں کہ جتنی اس شخص کی کہ جو ترقی اور سائنس کا خواہاں ہے۔ ظاہر بات ہے کہ خود اس فلسفے کہ حامی بھی کسی ایسے کلچر کو جو آزادی، ترقی اور سائنس کو رد کرتا ہو قبول کرنے اور اسکے پھیلاؤ کیلئے تیار نہیں ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ملٹی کلچرل ازم ایک دھوکہ ہے، درحقیقت اس کے نام پر معاشرے میں جو کلچر پھیلتا ہے وہ اباحیت پسندی، نفس پرستی، حرص وحسد، خواہشات کی کثرت، شہوت وغضب اور دیگر اخلاق رزیلہ کو فروغ دیتا ہے۔ یہ فلسفہ نفس پرستی کے تمام ذلیل ترین مظاہر کو عام کرنے نیز معاشرے میں انکی اشاعت کی اجازت دینے کا دوسرا نام ہے۔ انہیں معنوں میں ملٹی کلچرل ازم ایک ایسے خاص کلچر کو فروغ دیتا ہے جو مذہبی کلچر کی ضد ہوتا ہے۔ بھلا ایسا بھی ممکن ہے کہ کسی معاشرے یا کلچر میں بیک وقت حیا اور بے حیائی، خدا پرستی اور نفس پرستی، فکر آخرت اور فکر دنیا، زہد اور حب مال، شوق شہادت اور کراہیت موت، قناعت اور حرص وغیرہ کی صفات ایک ساتھ پنپ سکیں؟ اگر کوئی اس امکان کی غلط فہمی کا شکار ہے تو جتنا جلد ہو سکے اپنی اس خیالی جنت سے نکل آئے، کیونکہ اگر یہ ہونا ممکن ہے تو پھر یہ بھی ممکن ہے کہ ایک شخص ایک ہی وقت میں مسلمان بھی ہو اور کافر بھی۔ یہی وجہ ہے کہ ملٹی کلچرل ازم کا پرچار کرنے والے ممالک عورتوں کے اسلامی لباس کے خلاف پابندیاں لگاتے ہیں کیونکہ اس لباس سے انہیں مذہبی مساوات کے بجائے مذہبی برتری اور نفس پرستی کے بجائے خدا پرستی کی بو آتی ہے۔ لہذا خوب اچھی طرح سمجھ لینا چاہئے کہ ملٹی کلچرل ازم درحقیقت سرمایہ دارانہ نظام زندگی [یعنی آزادی، مساوات اور ترقی] کی معاشرتی بالادستی اور اسلام کے خاتمے کا دوسرا نام ہے، کیونکہ ملٹی کلچرل ازم کی علمی بنیادیں انہی مفروضہ اقدار پر قائم ہیں اور ایسے معاشرے میں صرف ہیومنز [وہ جنکی زندگی کا مقصد آزادی، خواہشات کی تکمیل اور سرمائے میں اضافہ ہو] ہی زندگی بسر کر سکتے ہیں۔ ایسے لوگ جو ہیومن ہونے کی نفی کرتے ہوں انکے لئے ایسے معاشرے میں

کوئی جگہ نہیں ہوتی۔ملٹی کلچرلزم درحقیقت اس مفروضے پر مبنی ہے کہ آزادی کے حصول کا کوئی ایک مخصوص طریقہ متعین نہیں کیا جا سکتا ، بلکہ یہ مختلف طریقوں اور کلچرز میں مختلف طریقوں سے حاصل کرنے کی کوشش کی جانی چاہئے۔کیونکہ عین ممکن ہے کہ مغربی طرز کے علاوہ کسی اور کلچر میں اسکی بڑھوتری کے زیادہ امکانات ہوں،مثلاً ہو سکتا ہے کہ چینی کلچر پھیلنے سے افراد کو زیادہ آزادی مل سکے وغیرہ۔الغرض ملٹی کلچرل ازم میں جو شے اصلاً مطلوب ہے وہ افراد میں آزادی یعنی سرمائے میں لامحدود اضافے کی خواہش کو بطور واحد مقصد زندگی کے طور پر قبول کرنا ہے۔

اس تفصیل کے بعد بھی اگر کوئی شخص اسلام کو ملٹی کلچرل ازم کا بانی و حامی اور دور نبوی کے مدنی معاشرے کو ملٹی کلچرل سوسائٹی سمجھتا ہے تو اسکی عقل پر ماتم کے سوا اور کچھ نہیں کیا جا سکتا ہے۔یہ بات تو ہر معمولی ذہن رکھنے والا شخص بھی سمجھتا ہے کہ دنیا کا کوئی صحیح الدماغ شخص جس شے کو حق اور جسے باطل گردانتا ہے ان دونوں کو کبھی اپنی زندگی میں مساوی حیثیت نہیں دیتا اور نہ ہی انہیں پنپنے کے برابر مواقع فراہم کرتا ہے۔یہ تو ایسا ہی ہے جیسے کوئی شخص مکان تعمیر کرے اور اسمیں بجلی کے دو طرح کے کنکشن اور تاریں لگوائے،ایک تو وہ جنکے آگے سوئچ بورڈ اور بٹن لگے ہوں،اور دوسرے اسی دیوار میں کئی مقامات پر بجلی کی تاریں کھلی چھوڑ کر یہ کہتا پھرے کہ میں نے اپنے بچوں کو پوری آزادی دے دی ہے، چاہیں تو سوئچ بورڈ سے پنکھا چلائیں اور اگر چاہیں تو ننگی تاروں کو ہاتھ لگا کر کرنٹ سے مر جائیں۔ایسے ہی ایک منزل سے نیچے دوسری میں جانے کیلئے ایک سیڑھی بنا دے،اور اسکے ساتھ بلندی سے گر کر مرنے کیلئے تین راستے بھی کھلے چھوڑ کر یہ کہے کہ میں نے سب راستوں کو برابر حیثیت دے دی ہے۔ظاہر بات ہے کہ اپنے بچوں کیلئے ایسا مکان بنانے کی ترکیب صرف کسی ذہنی مریض ہی کو سوجھ سکتی ہے ورنہ دنیا کا کوئی بھی شخص چاہے کتنا ہی آزادی کا دلدادہ کیوں نہ ہو ایسی حرکت نہیں کرتا بلکہ مکان بناتے وقت تمام احتیاطی تدابیر (safety-measures) اختیار کرتا ہے تاکہ جس شے [یعنی زندگی کے ہلاک ہو جانے] کو وہ برا سمجھتا ہے اس کی روک تھام کی جا سکے اور لوگوں کو اس بات کا زیادہ سے زیادہ پابند بنایا جا سکے کہ وہ ایسا طرز عمل اختیار کریں جسکے نتیجے میں انکے ہلاکت میں پڑنے کے امکانات کم از کم اور حصول خیر کے مواقع زیادہ سے زیادہ ہو سکیں۔پس اس اصول پر اس دعوے کی مضحکہ خیزی بھی جانچی جا سکتی ہے کہ اسلام ملٹی کلچرل ازم کا حامی ہے۔وہ ایسے کہ ایک طرف تو اسلام پوری قوت کے ساتھ اپنے لئے یہ دعوی کرے کہ صرف میں ہی حق ہوں باقی سب باطل ہیں نیز صرف میرا ہی راستہ حقیقی کامیابی اور نجات کا ضامن ہے باقی سب جہنم و بربادی کے راستے ہیں[**من یبتغ غیر الاسلام دینا فلن یقبل منه وهو فی الاخرة من الخاسرین** : آل عمران،۸۵]،لیکن اس کے بعد وہ اپنے معاشرے میں جہنم اور بربادی کی طرف لے جانے والی باقی تمام باطل قوتوں کا راستہ نہ صرف یہ کہ کھلا چھوڑ دے بلکہ ان کے فروغ کے لئے ہر قسم کی سہولتیں بھی فراہم کرے۔آخر دنیا میں وہ کون شخص ہے جو جس شے کو شر

سمجھتا ہے پھر اسے پھیلنے کی مکمل آزادی بھی دے دے؟ ایسی بے وقوفی کی امید تو ایک عام انسان سے بھی نہیں کی جاسکتی چہ جائیکہ اسکی نسبت اللہ اور اسکے رسول کی طرف کرنے کی جسارت کی جائے۔ لہذا ہمیں چاہئے کہ ہم چیزوں کی حقیقت کا علم حاصل کریں تاکہ ملٹی کلچرل ازم، enlightenment اور جمہوریت جیسے گمراہ کن تصورات کی نسبت اللہ اور اسکے رسول کی طرف کرنے سے بچ سکیں۔

اسلامی معاشرے میں غیر مسلمین کے حقوق کی اصل حقیقت

ہماری اب تک کی بحث کے بعد ذہنوں میں ایک آخری سوال یہ رہ جاتا ہے کہ اسلام اپنی سرحدوں میں غیر مسلمین کو ذمی بن کر رہنے کی نہ صرف یہ کہ اجازت دیتا ہے بلکہ انہیں اپنے ذاتی معاملات میں اپنی اپنی مذہبی تعلیمات کے مطابق رسوم عبودیت ادا کرنے نیز کئی دیگر حقوق بھی عطا کرتا ہے جسکی تفاصیل کتب فقہ میں دیکھی جا سکتی ہے۔ سوال یہ ہے کہ آخر اس آزادی اور حقوق کو اگر ملٹی کلچرل ازم نہ کہیں تو اور کیا کہیں؟ سیکولر طبقہ لوگوں کو دھوکہ دینے کیلئے اس بات کو بار بار دھراتا ہے نیز ہمارا معذرت خواں جدیدیت پسند طبقہ بھی اس جال میں پھنس کر ذمیوں کے حقوق سے جمہوریت کا اثبات کرنے لگتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ کسی بھی جزوی حکم کی مصلحت کو سمجھنے کا طریقہ یہ ہوتا ہے کہ اسے اس اجتماعیت کے جز کے طور پر دیکھا جائے جسکا وہ حصہ ہے، اگر آپ اس جز کو اسکے اصل مقام سے اٹھا کر کہیں اور رکھ کر اسکے معنی تلاش کرنے لگیں تو آپ لازماً غلطی کریں گے۔ انسانی آنکھ کا صحیح معنی اور مصلحت انسانی جسم ہی میں تصور کی جاسکتی ہے نہ یہ کہ اسے کسی دیوار پر ٹانگ کر اس کا معنی سمجھا جائے۔ ایسے ہی ذمیوں کے احکامات کو بھی اسلام ہی کی تعلیمات میں سمجھنا ممکن ہے نہ کہ انہیں جمہوری نظام میں داخل کرنے کی غرض سے سمجھا جائے۔ اب دیکھئے اسلام اس بات کا مدعی ہے کہ میرے سوا سب راستے جہنم کے راستے ہیں، لیکن سوال یہ ہے کہ دنیا کے جس خطے میں اللہ تعالی مسلمانوں کو دارالاسلام قائم کرنے کا موقع نصیب فرمادے اگر وہاں ایسے لوگ بھی آباد ہوں جو ابھی تک اسلام کی سچائی سے محروم ہیں تو ان کے ساتھ کیا سلوک کیا جائے؟ ظاہر ہے اسکے چار جوابات ممکن ہیں:

۱] انہیں ہر لحاظ سے برابر تسلیم کر کے یکساں مواقع فراہم کر دیئے جائیں

۲] انہیں قتل کر دیا جائے

۳] انہیں دارالاسلام کی سرحدں سے نکال باہر کیا جائے

۴] انہیں دارالاسلام میں اس لئے بسنے کا موقع دیا جائے کہ انہیں تبلیغ کے ذریعے آسانی سے دائرہ اسلام میں لایا جاسکے

ظاہر ہے پہلا جواب اسلام کے لئے قابل قبول نہیں کیونکہ اسکا مطلب تو اپنے اس دعوے ہی سے دستبردار ہو جانا ہے کہ اسلام ہی حق ہے۔ دوسرا جواب بھی اس لئے درست نہیں کہ اللہ تعالی نے یہ دنیا امتحان کے اصول پر قائم کی

ہے، نیز اسلام انسانی فطرت سے مایوس نہیں ہے بلکہ وہ اس بات کا قائل ہے کہ جب کفر والحاد کی اتھاہ گہرائیوں میں بھی ایک انسان کو قبول حق کی توفیق نصیب ہوسکتی ہے تو اس بات کی پوری امید کی جاسکتی ہے کہ درست تربیت اور صالح ماحول میسر آجانے پر انسان کسی بھی وقت اس حق کی طرف پلٹ سکتا ہے جو اسے ابدی ہلاکت سے بچانے والا ہے۔ پس یہی وجہ ہے کہ اسلام ایسے شخص کو اپنی سرحدوں سے باہر دارالکفر کی طرف نہیں دھکیلتا کہ یہ اسے جہنم کی طرف دھکیلنے کے مترادف ہے کیونکہ دارالکفر میں تو ایمان لانے کے مواقع دارالاسلام کے مقابلے میں کم ہو جائیں گے۔ لہذا اسلام اس بات پر تیار ہے کہ ایسے شخص کو دارالاسلام کی سرحدوں میں رہنے کی اجازت دے دی جائے تاکہ اسے **حتی یسمع کلام اللہ** کے مترادف اللہ کا پیغام سننے کا موقع مل جائے اور تبلیغ کے ذریعے دائرہ اسلام میں داخل کرلیا جائے۔ غیر مسلمین کو اپنی سرحدوں میں بسنے کی اجازت دینے کا مقصد ہرگز یہ نہیں کہ انہیں اپنے کفر پر جمے رہنے نیز اپنی آنے والی نسلوں تک اسے منتقل کرنے کا لائسنس دے دیا گیا ہے۔ اسلام کی اصولی تعلیمات کے مطابق بھی دیکھا جائے تو ہر غیر مسلم کو اسلام کی دعوت وتبلیغ کرنا ضروری ہے، اب اپنی سرحدوں سے باہر نکالنا درحقیقت خود اپنے اس کام کو مشکل بنانے کے ہم معنی ہے۔ پس معاشرے میں زندگی گزارنے کیلئے عرف کے مطابق جو حقوق ہونے چاہئیں اسلام ذمیوں کو ایسے تمام حقوق دیتا ہے اور یہی ان حقوق کا اصل پس منظر ہے۔

دوسری اہم بات یہ کہ اسلامی معاشرے میں ہرگز بھی مختلف کلچر نہیں پھیلتے، اور نہ ہی اس میں مختلف کلچرز کے ایسے مظاہر کی اجازت ہوتی ہے جو اسکے معاشرتی احکامات کے خلاف ہوں، بلکہ وہ آہستہ آہستہ سب کو اپنے ہی رنگ میں رنگ دیتا ہے۔ مثلاً اسلام ہرگز بھی اس چیز کی اجازت نہیں دے گا کہ کوئی غیر مسلم عورت یہ کہہ کر سکرٹ پہنے بازاروں میں گھومتی پھرے کہ یہ اسکے کلچر کا حصہ ہے۔ ایسے ہی ہم دیکھتے ہیں کہ اسلامی معاشروں کے عروج کے دور میں غیر مسلم بھی مسلمان علماء جیسا لباس پہننے میں نیز عربی زبان بولنے میں فخر محسوس کرتے تھے، بالکل اسی طرح جیسے آج کل کا مسلمان انگریزوں کی طرح سوٹ بوٹ میں ملبوس ہونے اور انگریزی بولنے کو اپنی شان سمجھتا ہے۔ کوئی اس غلط فہمی میں نہ رہے کہ اسلام کسی جبر کے ذریعے لوگوں کو اپنے رنگ میں رنگ لیتا ہے بلکہ افراد برضا ورغبت ہی اسکے تہذیبی شعائر کو اپنا لیتے ہیں، بالکل اسی طرح جس طرح آج کے مسلمانوں نے مغربی شعائر کو اپنی مرضی سے اپنی زندگی کے ہر گوشے میں اختیار کر رکھا ہے اور اس امر پر کسی نے انہیں مجبور بھی نہیں کیا۔

پس یہ چند باتیں اہل علم حضرات کی خدمت میں حاضر ہیں، اگر انہیں محسوس ہوتا ہے کہ اس میں جس رائے کا اظہار کیا گیا ہے وہ صائب نہیں ہے تو ہمیں ہماری غلطی پر مطلع کیا جائے تاکہ ہماری اصلاح ہوسکے، اور اگر یہ باتیں درست ہیں تو خدارا اللہ اور اسکے حبیب کریم ﷺ کی طرف ایسی بات کی نسبت کرنا چھوڑ دیں جس کے وہ مدعی نہیں مبادا ہم اس خدائی وعید کی لپیٹ میں نہ آجائیں **من اظلم ممن افتری علی اللہ کذبا. و اخر دعوانا ان الحمد للہ رب العالمین**